قیمت ۸ روپے

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے   امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

AUSTRALIA	A$ 4.50	DENMARK	D.KR. 1700	ITALY	LIT. 4000	NEW ZEALAND	NZ$ 5.00	SRILANKA	Rs. 50
BANGLADESH	Taka 25	FRANCE	Fr 13	JAPAN		NORWAY	N.Kr 15.00	SWEDEN	Kr 20
BELGIUM	Fr 90	FINLAND	F.MK 13.00	KOREA	W 2.200	PAKISTAN	Rs. 20	SWITZERLAND	Fr 4
BRUNEI	B$ 5.50	GERMANY	DM 4.50	MALAYSIA	RM 4.00	PHILIPPINES	P 30	THAILAND	B 50
CANADA	C$ 4.50	HONG KONG	HK$ 19.00	MALDIVES	Rf 15.00	SAUDI ARABIA	SR 4	U.K.	£ 2.00
CHINA	RMB 16.00	INDONESIA	RP 4,500 (INC PNN)	NETHERLANDS	G 4.30	SINGAPORE	S$ 3.50	U.S.A.	US $ 3.50

آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مجبور کو نظام جبر سے نجات دلانے کے لئے

اور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی پیغام کو چہار دانگ عالم میں عام کرنے کے لئے

اب

قائد ملی پارلیامنٹ ڈاکٹر راشد شاذ بہ نفس نفیس

ملک بھر میں

سیرتؐ کے عظیم الشان جلسوں سے خطاب فرمائیں گے

دنیا کے مختلف ملکوں اور ملک کے مختلف گوشوں میں سرکار دو عالمؐ کے نام کا غلغلہ بلند کرنے کے لئے ایک جامع پروگرام تشکیل دیا جارہا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ کوئی بھی قابل ذکر علاقہ سرکارؐ کے پیغام کی گونج سے خالی نہ رہ جائے۔ سال بھر کے لئے ملک گیر سفر کا تفصیلی نقشہ ترتیب دیا جارہا ہے۔ اگر آپ بھی اپنے علاقے کو اس فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو جلد از جلد رابطہ کیجئے۔

یاد رکھئے ! سیرت کا جلسہ ایک بڑا اعزاز ہے آپ بھی یہ سعادت حاصل کیجئے!
اور اس ملک کو سرکارؐ مدینہ کے رنگ میں رنگ دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔

اللہ کی نصرت اور اس کے رسولؐ کی قیادت آپ کے ہمراہ ہے۔

Milli Parliament
Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar New Delhi - 25
Phone : (011) 6827018/6926246 Fax : (011) 6946686

انٹرنیشنل

ملی ٹائمز

نئی دہلی

مئی ۱۹۹۸ء

قیمت: آٹھ روپے

سالانہ زرتعاون: ۱۰۰ روپے

بیرون ممالک سے: ۲۵ امریکی ڈالر

سالانہ زرتعاون منی آرڈر یا ڈرافٹ ارسال کریں

ڈرافٹ پر صرف اتنا لکھیں

Milli Times International New Delhi

اس شمارے میں

یکے از مطبوعات مسلم میڈیا ٹرسٹ

ایڈیٹر: محمد احمد سعید

ملی ٹائمز انٹرنیشنل

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

فون: 6926246 / 6827018

فاکس: (011) 6946686

اداریہ

گوتم بدھ کو یہ جاننے میں برسہا برس لگ گئے کہ ان کا تعلق ان پانچ فیصد لوگوں سے ہے۔ جو دنیا کے رخ کا تعین کرتے ہیں، جن کی کوششوں سے تاریخ کا دھارا مڑتا اور جن کی جدوجہد سے مستقبل کی صبح طلوع ہوتی ہے۔ ایک کرب تو یقیناً نوجوان بدھ کے اندر تھا جو ہر لحہ انہیں معمول کی زندگی جینے سے روکتا تھا۔ ان کے اندرون میں ہر لحہ ایک خاموش بغاوت پل رہی تھی جو بار بار ان سے کہتی تھی میاں تم پانچ فیصد لوگوں میں ہو ۹۵ فیصد لوگوں کے چکروں میں کیوں پڑ گئے ہو۔ زندگی صرف ایک بار جینے کو ملتی ہے بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ اس مقدس متاع کو شہزادگی کے جاہ و حشم میں ضائع کردو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ تمہاری قیمتی زندگی صرف اس امر میں گزر جائے کہ اس سے موروثی بادشاہت کو استحکام ملے اور تمہارے خاندان میں جہانگیری کی جو روایت چلی آرہی ہے اسے فروغ ملے، دوام حاصل ہو۔ یہ تو زندگی کا بہت ہی نامناسب سا استعمال ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے اپنی جیب میں سورج رکھنے والا شخص تاریکی کے ازالے کے لئے جگنو جمع کرتا پھرے۔ جب اس زندگی سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں تو ایک چھوٹی سی سلطنت کے چھوٹے سے بادشاہ بننے کو تم اپنی متاع حیات کیوں قرار دے لیتے ہو؟ زندگی تمہاری ریاست کی سرحدوں سے بھی دور بہت دور تک لامتناہی امکانات کا نام ہے۔

بدھ کو یہ محسوس تو ہوتا تھا کہ اس نے دنیا برتنے کی لت خواہ مخواہ لگائی ہے۔ وہ اس میدان کا آدمی نہیں لیکن دنیا کو چھوڑنا اور معمول کی زندگی کو خیرباد کہنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ زندگی کی آسائش مہیا تھی، خوبصورت دوشیزائیں سامان دلبستگی کے لئے ہر لحہ موجود تھیں، رقص و سرود اور ہاؤ ہو کے نغمے دل کو اپنی جانب کھینچ لیتے تھے۔ خوبصورت بیوی اور ننھے معصوم بچے کی محبت نے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ ایسی صورت میں معمول کی زندگی کو خیرباد کہنا اور ایک نئے غیر یقینی مستقبل کی طرف قدم اٹھانا کچھ آسان نہ تھا۔ لیکن بدھ بدھ تھا وہ کوئی عام انسان نہ تھا، اس میں ۹۵ فیصد والوں کی دنیا سے ایک ایسی زبردست جست لگائی کہ چشم زدن میں پانچ فیصد کے خیمے میں آگرا۔ یہ تو خیر ان پانچ فیصد لوگوں کا سانحہ ہے۔ جو ہمارے عہد میں ۹۵ فیصد لوگوں کی دنیا میں پھنس گئے ہیں اور جس کی وجہ سے آج امت کے کارواں کو رہنمائی فراہم کرنے میں سخت دشواریوں کا سامنا ہے۔

البتہ اس سے بھی بڑا سانحہ یہ ہے کہ پانچ فیصد کی دنیا کو خالی پاکر بہت سے وہ لوگ یہاں وارد ہوگئے ہیں۔ جو کسی زاویے سے بھی اس دنیا کے آدمی نظر نہیں آتے۔ دراصل ان کا تعلق ۹۵ فیصد کی دنیا سے ہے۔ جو خواہ مخواہ پانچ فیصد کی دنیا میں آگئے ہیں۔ مسلمانوں کے مؤقر اداروں، نامی گرامی انجمنوں اور رشد و ہدایت کی خانقاہوں میں خال خال ہی کوئی ایسا نظر آتا ہے جسے پانچ فیصد کی دنیا کا آدمی کہا جاسکے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ ہیں جو دراصل ۹۵ فیصد کے زمرے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہیں اپنی دنیا میں ڈھنگ کا کام نہ ملنے کی وجہ سے پانچ فیصد کے خیموں میں پناہ لینا پڑا ہے۔ پھر چونکہ یہ خیمے خالی تھے اور ان کے اصل مکیں ۹۵ فیصد کی دنیا میں پھنس گئے تھے اس لئے ان کم حوصلہ لوگوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ مہم جوئی کے نام پر معمول کی گھسی پٹی کاروائی انجام دیتے رہیں۔

جو لوگ ہمارے عہد میں اس بات کے خواہاں ہوں کہ پھر سے اس امت کو ایک انقلابی گروہ میں تبدیل کردیں اور جنہیں صورت حال کی سنگینی راتوں اٹھا کر رلاتی ہو اور جن کی مضطرب نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتی ہوں انہیں چاہئے کہ ہر لحہ یہ احتساب کریں کہ کہیں وہ خود ان ۹۵ فیصد لوگوں میں تو نہیں پھنس گئے ہیں کہ جب تک یہ حضرات معمول کی زندگی تج کر پانچ فیصد کے خیمے میں شامل نہیں ہوتے امت کے اوپر بے حوصلہ، نامراد، غیر مہم جو، ناآسودہ قیادت کا تسلط باقی رہے گا۔

(ادارہ)

مسلم سیاسی پارٹی

مکرمی۔ تین ماہ کے انتظار کے بعد ملی ٹائمز ملا۔ ظل ہما کے مراسلے کو پڑھنے کے بعد دوسرا صفحہ پڑھنے کو دل نہ چاہا۔ حقیقت یہی ہے کہ آج دنیا میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص ملت کو جہاد کا راستہ دکھانے والے قائد کی ضرورت ہے۔ ہم اب تک کافرانہ نظام کے لیے اپنا خون بہار ہے ہیں، نفاذ اسلام کی تحریک کے لیے بھی خون بہانے کی ضرورت ہے۔ وہی قوم آگے بڑھ سکتی ہے جو قربانیوں کی راہ پر آگے بڑھتی ہے۔ کامیابی و کامرانی ابھی کافرانہ نظام کے خلاف یونہی تو نہیں مل جائے گی اس کے لیے جان کی بازی لگانی پڑے گی۔ جب ایک مومن موت سے ملنے کے لیے بے چین ہوتا ہے تو زندگی و کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ آج اسلام کو ایسی ہی سوچ رکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ گزشتہ دو ماہ ملی ٹائمز پر ہی نہیں بلکہ ملت کا درد رکھنے والوں اور ملی ٹائمز کے مشن سے اتفاق کرنے والوں پر بھی بہت سخت گزرے ہیں۔ ہر کام میں مالی مسائل تو آتے ہی ہیں اور یہی قانون فطرت بھی ہے کہ جتنی محنت ہوگی اتنا ہی پھل بھی ملے گا۔ انشاء اللہ تعالی جب تھوڑی بہت کامیابی ہمیں حاصل ہوگی اور چند ایک لوگ بھی اس مشن میں ہمارے آپ کے ساتھ آجائیں گے تو اس وقت ہم سے کئی گنا خوشی آپ کو ہوگی کیونکہ آپ ہی نے اس پودے کو لگایا ہے۔ میں اللہ تعالی سے دعاگو ہوں کہ آپ کو ہمت اور ملی ٹائمز کو ترقی دے، آمین۔ سیاسی پارٹی کی تشکیل کے سلسلہ میں میرا ایک مشورہ یہ ہے کہ پارٹی میں ان ہی لوگوں کو شامل کیا جائے جو اپنی ذاتی زندگی میں شریعت پر کاربند ہوں، ملت کے لیے اپنا وقت دے سکیں اور ملت کے لیے مخلص ہوں۔ مولوی صورت ملی طالع آزماؤں سے دور ہی رہیں تو بہتر ہوگا۔ آج جو مختلف ملی جماعتیں ہیں، مجلس مشاورت، مسلم لیگ، انڈین مسلم لیگ، مجلس بچاؤ تحریک، اتحاد المسلمین، ملی کانسل، مسلم محاذ سب کا حال یہ ہے کہ کافرانہ نظام کے دروں پر کشکول گدائی لیے ملتے ہیں

محمد سجاد علی۔ گلبرگہ

مزید رہنمائی کیجیے

مکرمی ایڈیٹر صاحب

میں نے پہلی بار آپ کا رسالہ ملی ٹائمز ماہ مارچ پڑھا، بہت خوشی ہوئی اور ملت کی کمزوریاں دیکھ کر افسوس بھی۔ ترکی کے تعلق سے آپ کا تجزیہ درست ہے۔ رمزی یوسف پر امریکہ کا ظلم و استبداد انسانیت کے خلاف ہے، امریکہ اور اسرائیل ملت اسلامیہ کا مختلف سطحوں پر جس طرح استحصال کر رہے ہیں وہ بالکل ظاہر ہے۔ رسالہ کے حلقہ کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہمارا دس ممبروں پر مشتمل ایک پروگرام ہے جس کے تحت تعلیم بالغان کی کوشش کر رہے ہیں اور ہر فرد کے سامنے آپ کے پروگرام کو رکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مزید رہنمائی کریں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہر شہر میں چار حصوں میں ملی ٹائمز میٹنگ رکھی جائے اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کیے جائیں۔ آپ کا میگزین مارچ کے بعد سے پابندی سے خریدیں گے۔ بہت سے لوگوں کو مارچ کے شمارے کے مضامین سنائے لوگوں نے جہاد کی تائید کی، خصوصاً ڈاکٹر صاحب کا مضمون تو آج کے حالات کا بہترین تجزیہ ہے۔

سید اسماعیل۔ حیدرآباد

تعاون حاضر ہے

مکرمی۔ میں نئی مسلم سیاسی پارٹی کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اسے وقت کی اہم ضرورت سمجھتا ہوں۔ ویسے تو ہماری آرگنائزیشن ایک غیر سیاسی تعلیمی اور رفاہی تنظیم ہے لیکن میں آپ کی قائم کردہ سیاسی پارٹی کو آندھرا پردیش کی سطح پر بھرپور تعاون دینے کے لیے تیار ہوں۔ انشاء اللہ اس کاز کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت صرف کروں گا۔ میں آپ کو اس پارٹی کے قیام پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ یہ پارٹی ملت کے مفاد میں مددگار ثابت ہوگی۔

مرزا فاروق بیگ۔ گولکنڈہ

دل مطمئن ہے

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

میں نے سارے جریدے پڑھنا چھوڑ دیے ہیں۔ ہندوستان اور عالمی اسلامی برادری سے متعلق مسائل اور اسلامی تحریک کو مکمل پیش کرنے کا جو اچھوتا انداز ملی ٹائمز میں پڑھنے کو ملتا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے بڑے امام الہند اور امیر شریعت قسم کے لوگوں کے قد پستہ ہوجائیں گے۔ مجھے ناز ہے کہ ڈاکٹر راشد شاذ کی تحریروں نے ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ کی تقدس مآب شخصیتوں اور ان کے پروگراموں پر پڑے دبیز پردوں کو چاک کر کے رکھ دیا ہے اور صحیح سمت میں رہنمائی کی ہے میں عرصہ سے ایسے کسی کفن بردوش کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کر رہا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا ایجنڈا شریعت پر مبنی ہونا چاہیے مگر الناس علی دین ملوکہم کے تحت عوام الناس علماء و قائدین کے پیچھے چل رہے ہیں جنہوں نے سیکولر جمہوری پارٹیوں کے ایجنڈے کو اپنا رکھا ہے اس لیے ضروری امر جس پر آپ نے توجہ دی ہے انھیں مقدس ہستیوں کا آپریشن ہے۔ اب میں مطمئن ہوں بقول آپ کے ہندوستانی مسلمانوں کا قافلہ متحرک ہوسکتا ہے اور امارت کی تقسیم جو مسلمانوں کو کتنے ہی خانوں میں بانٹ چکی ہے، رک جائے گی۔ میں ایسی تحریک کے لیے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ اپنی ہر قربانی اور خون کا آخری قطرہ بھی دینے کو تیار ہوں مگر کاش آخر دم تک آپ اپنے اسی نصب العین پر ڈٹے رہیں۔ نیز اس مسئلہ کی بھی وضاحت ہونی چاہیے کہ مسلمان حکومت کی سازشوں کا مقابلہ کس طرح کریں کیونکہ جب مسلمان اپنے ایجنڈے کو سامنے رکھ کر تمام سیاسی ایجنڈوں کو پس پشت ڈال دے گا، تو اس کے سامنے مسائل کا ایک پہاڑ اٹھ کھڑا ہوگا، اس پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔

خالد مسعود ندوی۔ فروخ آباد

مشن کے لئے کام کررہے ہیں

مکرمی۔ عرض یہ کرنا ہے کہ آج بتاریخ 15 اپریل ملی ٹائمز انٹر نیشنل موصول ہوا، پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ ازیں قبل بھی کئی رسالے ہاتھ لگے، برابر مطالعہ کررہا ہوں۔ کافی دنوں سے اس مشن میں لوگوں کو شامل کرنے کے لیے کوشش کررہا ہوں۔ تین دوست فی الحال اس میں ہر طرح کا تعاون دینے اور اپنے علاقے میں مشن کے لیے کام کررہے ہیں۔ اب ہمارے لیے کوئی خدمت ہو تو مزید حکم جاری کریں انشاء اللہ ہم ہروقت تیار رہیں گے سیرت کا جو پروگرام تشکیل دیا جارہا ہے، اس کے متعلق مزید تفصیلات تحریر کریں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ضلع بہرائچ میں بھی سرکار دوعالم کا لایا ہوا پیغام عام کیا جائے لہذا اپنی فہرست میں بہرائچ کو بھی شامل کرلیجئے۔ ملی ٹائمز کا حلقہ مطالعہ بڑھانے کی کوشش کررہا ہوں۔

محمد شہروز خان ندوی۔ بہرائچ

اخلاص کی دعا ہے

محترمی۔ آپ کا ماہنامہ رسالہ "ملی ٹائمز" ہاتھ لگا جس کے مطالعہ کے بعد بہت خوشی ہوئی۔ اس بحرانی دور میں ملت اسلامیہ کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ میں دعاگو ہوں کہ آپ کی یہ کوشش کامیاب ہو، آمین! ثم آمین۔

اگر آپ کی سعی جمیل سے امت مسلمہ نبی برحق کے طریقے پر آجائے اور اپنی روایتی و تاریخی اتحاد کا مظاہرہ کرے پھر تو ہندوستان ہی نہیں، ساری دنیا کا نقشہ بدل جائے گا، بس دردمند مسلم کو اسی کو حقیقت کے شکل میں دیکھنے کی تڑپ باقی ہے۔ اللہ آپ کو اخلاص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد اسرائیل۔ بھاگلپور

کام آنا چاہتا ہوں

پچھلے تین چار سالوں سے میں ملی ٹائمز کا قاری ہوں۔ جب ملی ٹائمز کا شمارہ دیکھتا ہوں تو دل کو ایک سکون میرا کہنا ہے۔ خوشی محسوس ہوتی ہے یہ خوشی میں دوسروں کے ساتھ بانٹتا ہوں۔ پہلے میں ایک کاپی لاتا تھا اب چھ کاپیاں لاتا ہوں۔ میں بھی آپ کے کام آنا چاہتا ہوں تاکہ ہم سب مسلمان جو بکھرے ہوئے ہیں پھر سے ایک ہی پرچم تلے جمع ہوجائیں۔

بلال احمد۔ کشمیر

مسلم پولیٹکل فورم

مکرمی! گذشتہ چند برسوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی شناخت کے لئے آپ کی طرف سے جو کوشش ہورہی ہے اس نے اب ایک باضابطہ تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ اب سنجیدگی سے یہ سوچنے لگے ہیں کہ ان کے مسائل کا حل اب سیاسی پارٹیوں کے پاس نہیں بلکہ خود انہیں اپنی سیاسی صف بندی کے ذریعہ حالات کی تبدیلی کا کام انجام دینا ہوگا۔ یہ اللہ رب العزت کا فضل ہے اور آپ کی تحریروں کا اثر ہے کہ اب غیر مسلم سیاسی پارٹیوں میں موجود مسلمانوں سے امت کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ عام مسلمان یہ سمجھنے لگا ہے کہ وہ ہمارے نمائندہ نہیں بلکہ مشرک سیاسی آقاؤں کے وفادار ایجنٹ ہیں اس لئے ان سے کسی بھلائی کی توقع خام خیالی ہے۔

ابھی چند دن پہلے ملی کونسل کی طرف سے ایک ملی پولیٹکل فورم کے قیام کا اعلان ہوا ہے اور ان حضرات نے بھی مسلمانوں کو ایک سیاسی محاذ پر متحد کرنے کی بات کی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ سیاسی فورم آپ کی ایما پر بنا ہے یا اسے آپ کی تائید حاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کا اس فورم سے کوئی تعلق ہے تو مجھ کہ لینے دیجئے کہ آپ بھی جمہوریت اور سیکولرزم کی سڑی شراب کو نئی بوتلوں میں پلانے کا کام کررہے ہیں۔ اس لئے کہ کونسل کی طرف سے نئے فورم کے مقاصد میں جمہوریت کی حمایت میں فضا بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ البتہ اگر اس فورم کو آپ کی تائید حاصل نہیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں نئی سیاسی پارٹی کے نام ایک متبادل اور متحارب فورم قائم کرکے آنے والے دنوں میں واقعی اسلامی سیاسی پارٹی کا راستہ روک دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ بات تو طے ہے کہ اب مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی صف بندی کا وقت آگیا ہے اور یہ کہ اب ایک مسلم سیاسی پارٹی کا راستہ کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ مولانا اسرار الحق سے لے کر سید شہاب الدین تک اب مسلم سیاسی پارٹی کی بات کرتے ہیں حالانکہ کل تک ان جیسے لوگوں کی حلق سے یہ بات نہ اترتی تھی۔ اس لئے کہ سید صاحب مختلف سیاسی گھاٹ کا پانی پیتے رہے ہیں اور ملی کونسل کے اسرار الحق، ابھی کل کی بات ہے، ملائم سنگھ کے نمائندہ کی حیثیت سے الکشن کے میدان میں تھے۔ اب جب مسلم عوام نے انہیں مسترد کردیا تو یہ حضرت ایک نئے مسلم سیاسی فورم کے ذریعے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ دوبارہ بحال کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ کوئی کیا کررہا ہے۔ البتہ اس بات سے تکلیف ہوتی ہے کہ عالم فاضل لوگ کس طرح کافر و مشرک سیاسی آقاؤں کے خادموں کی حیثیت سے کام کررہے ہیں اور چلتے چلتے آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ مسلمانوں کو کافروں کا دست نگر بنائے رکھنے اور انہیں کافروں کے حق میں ووٹ دلوانے میں بعض چوٹی کے شرعی قاضی حضرات بھی پیش پیش ہیں۔ بلکہ ایک صاحب کے کمبل کی کہانی ابھی اخفائے راز ہی رہنے دیجئے۔ خطرہ ہے۔۔ انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آب گینوں کو

ملی ٹائمز کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ البتہ آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ مستند علماء کو ضرور سمجھائیے۔ ہوسکتا ہے ان میں بعض خدا سے ڈریں اور آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوجائیں۔ اس طرح آپ کا کام آسان ہوجائے گا۔ ویسے میں اپنے ساتھ نوجوان علماء کی ایک ٹیم کو آپ کے نقطہ نظر پر متفق کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ امید ہے آگے چل کر اس کام سے آپ کو تقویت ہو۔

مت پوچھئے، بس آپ لوگوں کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

احسان الحق مظاہری (پونہ)

Membership Form

for a proposed

Muslim Political Party

Form No.: ______

Date.: ______

ملک میں عنقریب ایک مسلم سیاسی پارٹی تشکیل دی جانے والی ہے۔ جو ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کے ذریعہ اس ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرے گی۔ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی بے سمتی کا خاتمہ ہوگا اور پچاس سالہ سیاسی غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔ اگر آپ اس پارٹی کے مقصد سے اتفاق کرتے ہوں اور اس ملک میں منجمد اسلامی ایجنڈے کو دوبارہ متحرک کرنا چاہتے ہوں تو یہ بتائیے آپ اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں۔ آج ہی اس فارم کو پر کیجئے اور اللہ کا نام لے کر ہمیں ارسال کردیجئے۔

Name: ______ **Fathers Name:** ______ **Age:** ______

Educational Qualification: ______

Permanent Address: ______

Address for Correspondance: ______

Phone: ______

Phone Office: ______ **Phone Res.:** ______

Health Condition ☐ Ecellent ☐ Good ☐ Poor

Languages Known ☐ English ☐ Urdu ☐ Hindi ☐ Other

عہد نامہ

میں اس مشن کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کردینے کا عزم کرتا ہوں۔

خصوصیت کے ساتھ میں ہر روز ☐ گھنٹہ اس مشن کو دوں گا۔ میری خدمت درج ذیل کاموں کے لئے پیش ہے:

اطراف میں سفر ☐ علاقے میں چھوٹے چھوٹے پروگرام منعقد کرنا ☐ لیف لٹ تقسیم کرنا اور اشتہار لگانا ☐

علاقائی زبان میں مسلم پارٹی کے لٹریچر کا ترجمہ کرنا ☐ مقامی طور پر لٹریچر کو طبع کرانا ☐ اس مشن کے مالی تعاون کے لئے اہل ثروت کو آمادہ کرنا ☐

ملی ٹائمز کو بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہونچانا ☐ عوامی رابطے کا پروگرام منعقد کرنا یا کوئی اور خدمت: (تفصیل لکھئے)

______

Milli Parliament

Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Tel: +91-11-6827018, 6926296 Fax: +91-11-6946686

اے خاصہ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے

اے خدا کے رسولؐ!

فدا ہوں میرے ماں باپ، قربان جائیں ہماری آرزوئیں اور اولاد

مدت گزری سوچتا رہا، تڑپتا رہا، اضطراب میں راتیں گزریں اور صبح ہونے کو نہ آئی۔ شب سے سحر ہونے لگی لیکن اس سحر سے سپیدہ سحر طلوع نہ ہوا۔ رات ہی رات ہر طرف رات، مکمل تاریکی جیسے تاریکی کے عذاب سے تنگ آکر دم گھٹنے لگے۔ جیسے صحرا میں کوئی مسافر راستہ بھٹک گیا ہو، جیسے اندھیرے میں کوئی فوج اپنے ہی ساتھیوں پر حملہ آور ہوگئی ہو اور نفسی نفسی کی چیخ و پکار میں یہ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ واقعی یہاں کون سا معرکہ گرم ہے اور کس کے ہاتھوں کس کا قتل ہو رہا ہے؟

سمت کے کھوئے جانے کا احساس اور نہ دکھائی دینے کا عذاب کتنا اذیت ناک ہے۔ ہند کے ان باسیوں پر جو خود کو۔ اے خدا کے رسول۔ آپ کا پیروکار کہتے ہیں۔

سرزمین ہند میں آپ کے ماننے والوں پر آج جو کیفیت طاری ہے وہ کسی عذاب سے کم نہیں۔ ایک عقوبت گاہ ہے جہاں ہر لحہ جہنم کا سا عذاب جاری ہے گویا ہر لحہ تیرے ماننے والے اس سرزمین میں ایک ارضی جہنم میں سانس لینے پر مجبور ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے۔ اے خدا کے رسول۔ کہ اذیت کی یہ زندگی اب ان کے معمول کا ایک حصہ بن گئی ہے اور اس ملک کے پچیس کروڑ مسلمانوں کو ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ ایک معمول کی زندگی کا حصہ ہو۔

کہنے کو اس ملک میں ان کی تعداد کچھ کم نہیں۔ سرکاری اعداد و شمار انہیں بارہ کروڑ بتاتے ہیں اور خود اہل ایمان کا اپنا اندازہ ہے کہ ان کی تعداد پچیس کروڑ سے کم نہ ہوگی لیکن یہ بھی عجب ماجرا ہے کہ اتنی بڑی عددی قوت کو اس ملک میں اقلیت کا نام دیا جاتا ہے اور خود اہل ایمان بھی خود کو اقلیت کہنے اور کہلانے پر مصر ہیں۔ پچاس سال سے اقلیت اقلیت کی رٹ لگانے سے اب ان کے اندر اقلیتوں والی چال ڈھال بھی پیدا ہوگئی ہے۔ خود کو کمزور سمجھنے کی نفسیات نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ وہ اب ہر لحہ اپنی حفاظت کو سوچتے اور عافیت کی تلاش کو اپنا ہدف جانتے ہیں حالانکہ۔ اے خدا کے رسول۔ اللہ کی کتاب میں اقلیت کی اکثریت پر فتح کے فلسفے کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور خود آپ نے اپنے عمل سے ہمیں یہی تو درس دیا ہے کہ مٹھی بھر اہل حق کا گروہ باطل کے اتھاہ سمندر پر قابو پالیتا ہے۔

بدر کا میدان اور اہل ایمان کی بے سروسامانی اور۔ اے خدا کے رسول۔ آپ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے یہ کلمات کہ بار الہا! اگر آج مٹھی بھر اہل ایمان کا یہ گروہ اس سرزمین سے مٹا دیا گیا تو شاید قیامت تک کوئی تیرا نام لینے والا نہ ہوگا۔ تب بھی۔ اے خدا کے رسول۔ اللہ کی خصوصی نصرت کے سہارے ٹوٹے پھوٹے پریشان حال اہل ایمان کے قافلے نے منظم کفر کو شکست دے دی تھی۔ ایسا بھی نہیں کہ بدر کا یہ واقعہ ہماری تاریخ کی کتابوں سے غائب ہوگیا ہو۔ ہم اپنی ملی مجالس میں اس واقعہ کو سنتے اور سر دھنتے ہیں لیکن عملی دنیا میں نہ جانے کیوں ہم پر اقلیت کی نفسیات حاوی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب ہماری ملی زندگی کی تمام تر منصوبہ بندی ایک اقلیت کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ ہم خود کو مٹھی بھر اہل ایمان کا ایک گروہ نہیں سمجھتے بلکہ ایک مذہبی اقلیت گردانتے ہیں جو ہر لحہ اپنے تحفظ کے خوف سے دوچار ہے۔

حد تو یہ ہے کہ اب ہمارے درمیان ایسے ادارے موجود ہیں جو مسلمانوں کو
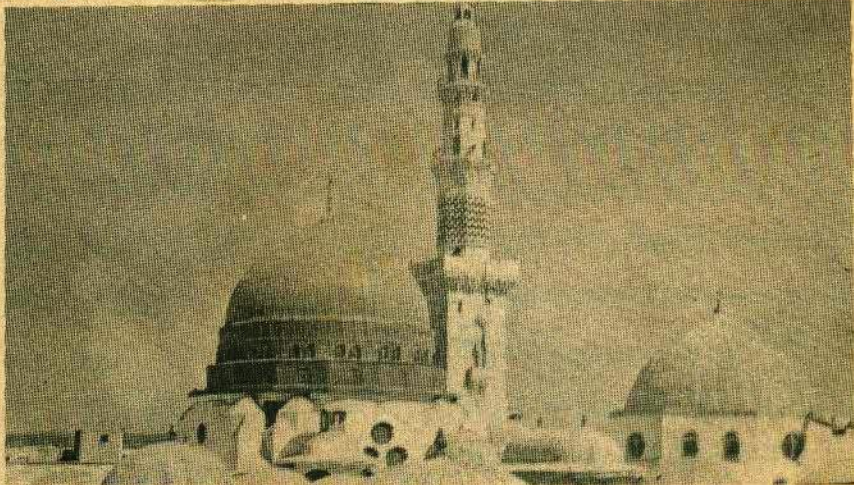
اقلیت باور کرانے اور اقلیت کی حیثیت سے ان کو زندگی جینے کی تربیت دے رہے ہیں بلکہ بعض صوبوں میں اور مرکزی سطح پر بھی نظام کفر نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے باضابطہ کمیشن قائم کر رکھے ہیں۔ اور۔ اے خدا کے رسول۔ آپ کے پیروکار انصاف کی تلاش میں ان بے ضرر اداروں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ یہ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ اے خدا کے رسول۔ اور کتنا عجب ہے یہ پروپیگنڈہ کہ شیروں کو یہ یقین آجائے کہ وہ واقعی گیدڑ ہیں اور اپنی گیدڑیت کے خیال میں بمتلا وہ اپنی زندگی کی زمام کار کسی اور کے حوالے کردیں۔ حالانکہ ان کی شکل و صورت شیروں جیسی ہے۔ پنجوں میں وہی قوت اور چال ڈھال میں وہی جاہ و جلال نمایاں ہے لیکن نہ جانے کیوں انہیں یہ یقین ہوچلا ہے کہ وہ اب شیر نہیں رہے۔ حالانکہ جو لوگ اس ملک پر پچھلے پچاس سالوں سے حکمراں ہیں۔ عددی اعتبار سے ان کی قوت اہل ایمان سے بہت کم ہے لیکن وہ کسی اقلیت کی نفسیات سے کہیں اوپر اٹھ کر ایک مصنوعی اکثریت کے زعم میں بمتلا ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں جہاں شیروں پر گیدڑوں کی حکمرانی قائم ہوگئی ہے۔

اے خدا کے رسول۔ آپ کے امتی اس سرزمین میں بے یارو مددگار ہیں۔ اسلاف کی دلی اب ان لوگوں کے قبضے میں ہے جو ہر لمحہ آپ کی ایک ایک نشانی مٹانے پر تلے ہیں۔ انہیں اس بات سے چڑ ہے کہ مسجدوں سے اللہ کی کبریائی اور آپ کی رسالت کا اعلان ہو نوبت بہ ایں جا رسید کہ نظام کفر کی بعض عدالتوں نے اشھد ان محمدا رسول اللہ کہنے پر باقاعدہ اعتراضات وارد کردیئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد کی رسالت کا اعلان ذرا دھیمے دھیمے کرو اس طرح کرو کہ ہماری دیواروں میں کوئی شگاف محسوس نہ ہو۔ نہ جانے کتنی مسجدیں ہیں جو مسمار کردی گئیں۔ نہ جانے کتنے قبرستان توسیعی منصوبوں کی زد میں آگئے۔ اسلاف کی دلی جہاں ہر چہار طرف اسلامی علامتوں کی بہتات تھی، جہاں آپ کے پیروؤں نے کم و بیش ہزار سال تک حکومت کی تھی اور جس شہر کے ذرے ذرے سے اسلاف کی یاد تازہ ہوتی تھی اب اسی شہر میں مساجد اصطبل میں بدل گئے ہیں۔ عید گاہوں پر غاصبوں کا قبضہ ہے۔ قبرستان سکڑتے سکڑتے غائب ہوگئے ہیں اور جو مسجدیں فن تعمیر کے بہترین

اے خدا کے رسولؐ۔ اس وقت بھی امت کے اندر ماہرین شریعت کی کمی نہ تھی اور اس حقیقت کو جاننے والے موجود تھے کہ سابق دارالاسلام کے کسی حصے کی آزادی کے لئے کسی دوسرے حصے کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ دشمن سے سر زمین اسلام کے ایک انچ کا سودا کرنا بھی شریعت نے حرام قرار دیا

اے خدا کے رسول۔ آپ کے امتی اس سرزمین میں بے یارو مددگار ہیں۔ اسلاف کی دلی اب ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔ جو ہر لمحہ آپ کی ایک ایک نشانی مٹانے پر تلے ہیں۔ انہیں اس بات سے چڑ ہے کہ مسجدوں سے اللہ کی کبریائی اور آپ کی رسالت کا اعلان ہو۔

نمونوں کی حیثیت سے اب بھی باقی ہیں ان میں سے بیشتر میں اہل ایمان کو نماز کی اجازت نہیں۔ کل تک جن عالیشان مسجدوں میں قال اللہ قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں آج ان میں چمگادڑ پناہ گزیں ہیں۔ ویرانی کا عجیب عالم ہے۔ لگتا نہیں کہ کبھی اسی راستے اہل ایمان کے قافلے گزرے تھے۔

وہی کارواں جس نے آپ کی قیادت میں مکہ سے یثرب کو کوچ کیا تھا اور جو آناً فاناً دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا تھا اور جس کے جاہ و جلال کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کے حوصلے پست ہوجاتے تھے آج وہی کارواں۔ اے خدا کے رسول۔ سرزمین ہند میں بے یارومددگار ہے۔ کوئی پچاس سال پہلے کی بات ہے جب تاریخ کے نازک لمحے میں آپ کی امت کے ساتھ ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ نہ جانے پوری امت پر یہ خیال کب اور کیسے غالب آگیا کہ وہ تعداد میں تھوڑے ہیں۔ پروپیگنڈہ اتنا سخت تھا کہ بڑے بڑوں کی عقل کند ہوگئی۔ حواس منجمد ہوگئے اور بہتوں نے صرف اپنے امان کے لئے ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا بگل بجادیا۔ حالانکہ۔ اے خدا کے رسول۔ اس وقت بھی امت کے اندر ماہرین شریعت کی کمی نہ تھی اور اس حقیقت کو جاننےن والے موجود تھے کہ سابق دار الاسلام کے کسی ایک حصے کی آزادی کے لئے کسی دوسرے حصے کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ دشمن سے سرزمین اسلام کے ایک انچ کا سودا کرنا بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اگر کوئی راستہ تھا تو صرف یہ کہ سابق دار الاسلام کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کی کوشش کی جاتی لیکن تب امت کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی جو اسلام اور مسلمانوں کے مصالح سے واقف نہ تھے۔ ان کی تربیت مغرب کی دانش گاہوں میں ہوئی تھی۔ وہ انہیں کی زبان بولتے اور انہیں کا خیال سوچتے تھے۔ رہے روایتی اہل شریعت تو وہ پہلے ہی گاندھی کے ہاتھوں پر بیعت کرچکے تھے۔ پھر ایسی حالت میں ان لوگوں کی کیونکر نہ بن آتی جو اسلامی تعلیم سے نابلد نظام اسلامی کے قیام کا نعرہ بلند کررہے تھے۔ نعروں اور ہنگاموں کا ایک ایسا طوفان آیا جس میں بڑے بڑوں کے دل و دماغ ماؤف ہوگئے۔ بے شمار اہل ایمان کی قربانیوں سے آزادی کا جو سورج طلوع ہوا اس نے آنے والے دنوں میں برصغیر ہندو پاک میں قوت اسلامی کا چراغ گل کردیا گویا وہ ایک رات تھی جو صبح کی شکل میں

نمودار ہوگئی تھی ۔ اہل ایمان کی قوت تین حصوں میں منتشر ہوگئی ۔ ہندوستانی مسلمانوں پر جو گزری سو گزری خود پاکستان او بنگلہ دیش کو دوبارہ دار الاسلام بننا نصیب نہ ہوا اور اب بھی آپ کی لائی ہوئی شریعت الٹے سیدھے لوگوں کی خود ساختہ شریعت کے تابع ہے ۔ کتنا بڑا ظلم ہے یہ ۔ اے خدا کے رسول ۔ آپ کی شریعت مطہرہ کے ساتھ کہ جن لوگوں نے آپ کے نام پر ایک خطہ زمین حاصل کیا تھا انہوں نے آپ ہی کی شریعت کو اپنے ہوا و ہوس کے تابع بنا رکھا ہے ۔

منقسم ہندوستان میں آپ کے پیروکاروں پر یہ عرصہ بہت سخت گزرا ہے ۔ اگر جان جاتی اور مال کا زیاں ہوتا تو ہمیں اس کا کچھ زیادہ افسوس نہ ہوتا کہ ہم یہ سب کچھ ۔ اے خدا کے رسول ۔ آپ کے لیے قربان کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں لیکن ہمیں شرمندگی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ہم نے جو کچھ کھویا ہے وہ آپ کے راستے میں نہیں، جو قربانیاں دی ہیں وہ آپ کے مشن کے لئے نہیں ۔ ہمیں قلق ہے اس صورت حال کا لیکن ہم کرتے بھی تو کیا کہ ہم میں سے بہتوں کو اس صورت حال کا احساس ہی نہ تھا

آج جب دلی کے تخت پر ہم آپ کے دشمنوں کو چیختا چنگھاڑتا دیکھتے ہیں تو ہمارا دل ڈوبا جاتا ہے کہ ہائے یہ سب کیسے ہوگیا؟ ہمیں افسوس ہے ۔ اے خدا کے رسول ۔ کہ پچیس کروڑ پیروکاروں کی موجودگی کے باوجود آپ کی شریعت اس ملک میں معطل ہے اور خود آپ کے امتی اس بات پر مجبور ہیں کہ وہ کارگہہ حیات میں شریعت کفر کی اتباع کریں حتی کہ مسلم پرسنل لاء کے نام جو شریعت سے علامتی تعلق قائم ہے اب اسے بھی ختم کرنے کا اعلان ہو رہا ہے ۔ ہمیں خطرہ ہے کہ کہیں ہم لوگ پورے کے پورے کفر میں داخل نہ ہو جائیں لیکن اے خدا کے رسول ۔ آپ کو تو آدھے کچے پکے مسلمان بھی پسند نہیں ۔ پھر ہم ہندوستانی مسلمان جن کی پوری زندگی نظام کفر کی اتباع میں لت پت ہے، کس منہ سے آپ سے اپنا تعلق جتائیں؟

یقیناً ہم سے بڑا جرم سرزد ہوا ہے ۔ پچھلے پچاس برسوں سے آپ کے پیروکاروں نے اس ملک میں آپ کے سیاسی ایجنڈے کو منجمد کر رکھا ہے ۔ اے خدا کے رسول ۔ کہنے کو تو یہ سب خود کو آپ کا پیروکار بتاتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ان لوگوں نے کفار و مشرکین کی اتباع اختیار کر رکھی ہے ۔ کہنے کو تو وہ آپ کے امتی ہیں لیکن کم ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے کفار و مشرکین کے ہاتھوں پر بیعت نہ کی ہوگی ۔

اے خدا کے رسول ۔ کتنا عجیب ہے یہ تضاد کہ جو لوگ مسجد کے منبروں سے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کی دعائیں کرتے ہیں وہی لوگ غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کو اقتدار سونپنے کے لئے فتوے جاری کرتے ہیں ۔

اے خدا کے رسول ۔ آپ نے تو یہ کہا تھا کہ کفر ملت واحدہ ہے ۔ یہ سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں، معاون اور رفیق ہیں لیکن ہم میں کچھ ایسے عقل مند پیدا ہوگئے ہیں جو بعض کافروں کو سیکولر بتاتے ہیں ۔ مسلمانوں کا مونس و غمخوار گردانتے ہیں حالانکہ ان ہی سیکولر کافروں کے ہاتھوں گذشتہ پچاس برسوں سے امت پر قیامت ٹوٹتی رہی ہے اور ۔ اے خدا کے رسول ۔ آپ نے مومن کی فراست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی تو فرمایا تھا کہ وہ ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا لیکن اب ہمارے درمیان ایسے لوگ عنقا ہوگئے ہیں ۔ آپ کی امت پچاس برسوں سے ایک ہی بل سے بار بار ڈسی جاتی رہی ہے ۔ طرفہ تو یہ ہے کہ اب بھی آپ کی امت میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس ملک میں سیکولر جمہوری قدروں کی بحالی کو اپنا فریضہ قرار دیئے بیٹھے ہیں ۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو بزعم خود اپنے آپ کو شریعت کا محافظ گردانتے ہیں ۔ اے خدا کے رسول ۔ ان کی عقل کو کیا ہوگیا ہے ۔ آپ نے تو اپنے پیچھے خلافت کا نظام چھوڑا تھا پھر اہل شریعت کو سیکولر ڈیموکریسی کے قیام کا ایجنڈا کہاں سے ہاتھ آگیا؟

ہاں ۔ اے خدا کے رسول ۔ یہی اہل شریعت آپ پر یہ بہتان بھی لگاتے ہیں کہ آپ نے نعوذ باللہ جمہوری حکومت قائم کی حالانکہ آپ کی بنیادی دعوت بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلانے پر مرکوز تھی ۔ آپ نے بندوں سے قانون سازی کا حق چھین کر انہیں خدائے واحد کے قوانین کا تابع بنایا لیکن آج ۔ اے خدا کے رسول ۔ آپ کی امت کے بڑے بڑے اہل تقویٰ جمہوری قدروں کی بحالی کے لئے کام کر رہے ہیں حتی کہ بعض لوگوں نے اب غیر اسلامی خیالات کو الہامی کی سند بھی عطا کر دی ۔

اے خدا کے رسول ۔ آپ ہی بتائیے کہ آپ کی امت اب رہنمائی کے لئے دیکھے تو کدھر دیکھے کہ جن لوگوں سے رہنمائی کی توقع تھی وہ اسلامی ایجنڈے سے

اے خدا کے رسولؐ ۔ آپ نے تو یہ کہا تھا کہ کفر ملت واحدۃ ہے ۔ یہ سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں ، معاون اور رفیق ہیں لیکن ہم میں کچھ ایسے عقل مند پیدا ہوگئے ہیں جو بعض کافروں کو سیکولر بتاتے ہیں ، مسلمانوں کا مونس و غمخوار گردانتے ہیں ۔

دست بردار ہوچکے ہیں ۔ وہ اس ملک کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کے بجائے یہاں جمہوریت اور سیکولرزم کا قیام چاہتے ہیں ۔ ان کی نظروں میں شریعت محمدی کا مطلب صرف نکاح و طلاق کے مسائل ہیں ۔ مصیبت تو یہ ہے ۔ اے خدا کے رسول ۔ کہ ان حضرات نے اپنے ارد گرد تقدس کی ایسی قبا لپیٹ ہے کہ ان کی تقدس بھری شخصیت کے آگے آپ کی حدیث بھی پھیکی پڑجاتی ہے اور جب کہیں کسی گوشے سے آپ کا انقلابی پیغام سنائی دیتا ہے تو عام مسلمان یہ کہنے لگتے ہیں کہ اگر اسلام کا مطالبہ یہی کچھ ہوتا تو پھر اس ملک میں بڑی بڑی تقدس والی شخصیتیں خاموش کیوں بیٹھتیں ؟ ۔ اے خدا کے رسول ۔ ایک طرف ان کا تقدس ہے اور دوسری طرف آپ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے کلمات ۔ لیکن افسوس کہ ان حضرات کے مکروہ تقدس اور بزدلانہ تاویلات کے آگے آپ کی باتوں کی چمک ماند پڑگئی ہے ۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے ۔ اے خدا کے رسول ۔ کہ خدا کی کتاب تو صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے امور کا نگراں نہیں بنایا جاسکتا (ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا) لیکن مکروہ تقدس والی شخصیتیں علی الاعلان کفار و مشرکین کو ووٹ دینے اور انہیں برسراقتدار لانے کے لئے کام کرتی ہیں ۔ کتنے جری ہیں یہ لوگ کہ اس جرم عظیم کے ارتکاب کے باوجود وہ آپ سے اپنا تعلق بتانے میں تکلف محسوس نہیں کرتے ۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہی ہیں جنہوں نے بظاہر تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کررکھا ہے لیکن پس پردہ ان کی وفاداریاں کافر سیاسی آقاؤں کے ساتھ ہیں ۔

اے خدا کے رسول ۔ ایسا بھی نہیں کہ آپ کی تعلیمات بالکل ہی مسخ ہوگئی ہیں ۔ یقیناً اسی ملک میں ایسے اہل دل بھی ہیں جو شریعت کے مطالب سے پوری طرح آگاہ ہیں لیکن اہل علم کے بڑے حلقے پر نہ جانے کیوں مدت سے مداہنت کا عذاب طاری ہے ۔ ان میں سے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو موجودہ نظام کفر کو الٹ پھینکنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ان میں سے بیشتر نے عافیت کا بپتسمہ قبول کررکھا ہے ۔ مدارس کی چہار دیواریوں کے اندر سکون ہے تبدیلیوں کا گزر ادھر سے نہیں ہوتا ۔ بعض روحانیت کے مدارج طے کرنے میں منہمک ہیں تو بعض اوراد و وظائف کے شغل میں مبتلا گویا جنت کا حصول کوئی اعداد و شمار کا کھیل ہو ۔ اپنے نجات کی فکر میں تو لوگ دبلے ہوئے جاتے ہیں لیکن آپ کے دین کو مغلوب دیکھ کر کسی کا وجود نہیں لرزتا ، کسی دل میں ہلچل برپا نہیں ہوتی ، کہیں اضطراب کا لاوا نہیں پھٹتا ۔ اے خدا کے رسول ۔ آپ کے دور میں ان جیسے رجال اہل اللہ کی کوئی قبیل نہیں پائی جاتی تھی پھر یہ مذہب کا کون سا ایڈیشن ہے جو ہمارے عہد میں اعتبار پاگیا ہے ۔

اے خدا کے رسول ۔ آپ کی یہ پریشان امت جائے تو کہاں جائے ؟ دیکھے تو کدھر دیکھے ؟ بہت سے ایسے ہیں جو آپ کے عشق میں شب و روز دبلے ہوئے جاتے ہیں ۔ جن کی پوری زندگی آپ کا نام لیتے گزری ہے ۔ ان کی صورت شکل پر تقوی کی مہر ثبت ہے لیکن نہ جانے کیوں جب ہم آپ کے اسوہ سے ان تصویروں کو ملاتے ہیں تو ہمیں یہ تصویریں کسی اور خود ساختہ اسلام کا ایڈیشن معلوم ہوتی ہیں ۔ آخر یہ کیسی اسلامی زندگی ہے کہ جہاں پوری زندگی آپ کی اتباع میں گزری لیکن اللہ کی راہ میں جسم پر ایک ہلکا سا خراش بھی نہ لگا ۔ آخر اللہ کی کبریائی کا یہ کیسا نعرہ تھا جس نے نظام کفر کے ایوانوں میں ارتعاش برپا نہ کیا ؟ آخر یہ کیسے لوگ ہیں جو اہل ایمان کے درمیان بھی معتبر ہیں اور نظام کفر بھی ان کی پذیرائی میں پیچھے نہیں ؟ ۔ اے خدا کے رسول ۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر اس طرح ٹھنڈے ٹھنڈے جنت کو راستہ جاتا تھا تو آپ نے اپنے عہد کے مسلمانوں سے جان و مال کے نذرانے کا مطالبہ کیوں کیا تھا ؟ اگر ٹھنڈے ٹھنڈے اوراد و وظائف سے نظام کفر کو بلا پھینکنا ممکن تھا تو پھر آپ کو تلوار اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ آپ تو سراپا رحمت ہیں ۔ اے خدا کے رسول ۔ پھر یہ کون لوگ ہیں جو آپ ہی کے راستے پر چلنے کے دعویدار ہیں لیکن تلوار کا عنصر ان کی زندگیوں سے یکسر غائب ہے ؟ آپ ہی بتائیے کہ ان چاکلیٹ مسلمانوں کا اسلام کس قدر قابل اعتبار ہے ؟

نظام کفر کی عملداری میں اسلام کی عجیب عجیب شکلیں پیدا ہوگئی ہیں ۔ ان میں سب سے مقبول لولی پال اسلام ہے جس پر عمل کرنا بہت آسان ، بالکل میٹھا میٹھا ، اپنے بھی خوش ، غیر بھی مطمئن ۔ اہل ایمان اس زعم میں مبتلا ہیں کہ تسبیح کا ہر دانہ جنت میں ان کا مقام بنا رہا ہے اور نظام کفر بھی خوش کہ اس اسلام سے اسے کوئی خطرہ نہیں ۔ اے خدا کے رسول ۔ سرزمین ہند میں آج اسی اسلام کو قبولیت عام ہے ۔ رہا وہ اسلام جو اللہ کی کبریائی کے علاوہ کسی اور کی کبریائی کو تسلیم نہیں کرتا تو ۔ اے خدا کے رسول ۔ اسلام کا وہ ایڈیشن یہاں مغضوب ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی باتیں نہ کرو امن کو خطرہ ہوجائے گا ، یہ ایک سیکولر ملک ہے ، یہاں اس قسم کی انتہا پسندانہ باتیں نہیں کی جانی چاہیے ۔

کس غریب الوطنی سے دوچار ہے ۔ اے خدا کے رسول ۔ آپ کا قافلہ اس ملک میں ۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب اس قافلے کو دیکھ کر یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ وہی قافلہ ہے جو آپ کے دین کے غلبے سے لئے جزیرۃ العرب سے چل کر یہاں تک پہنچا تھا ۔ یقیناً اس قافلے میں نیابت رسول کے دعویدار بھی ہیں اور

وہ بھی ہیں جن کی زبانیں قال اللہ و قال الرسول کے ورد سے تر بتر ہیں لیکن ان میں سے کم ہی ہیں جنہیں نیابت رسول کے عالی منصب کا احساس ہے ۔ ان کی اونچی ٹوپیوں اور جبہ و دستار پر نہ جائیے ۔۔ اے خدا کے رسول ۔۔ کہ ان کی حیثیت تو بس ایک یونیفارم کی سی ہے جس طرح ڈاکٹر اور وکیل اپنی شناخت کے لئے خاص قسم کا یونیفارم پہنتے ہیں، جس طرح نرسیں خاص وضع قطع کا لباس اختیار کرتی ہیں اسی طرح مذہبی لوگوں نے خاص تراش خراش کی وضع بنائی ہوئی ہے ۔ اس کا بھلا تقویٰ سے کیا تعلق کہ آپ کے عہد میں تو مذہبی لوگوں کی کوئی خاص وضع قطع نہ ہوا کرتی تھی بلکہ آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے خلفاء کا یہ طرز رہا کہ اگر وہ مجلسوں میں بیٹھے ہوں تو ان کی وضع قطع عام مسلمانوں سے اتنی ملتی جلتی ہوتی کہ باہر سے آنے والوں کو یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ اس مجلس میں مسلمانوں کا خلیفہ اور ان کا امیر کون ہے ؟ لیکن آج آپ کی نیابت کے دعویداروں نے ایسی خاص وضع قطع اختیار کر رکھی ہے جو دور ہی سے ان کے تقویٰ کی چغلی کھاتی ہے ۔
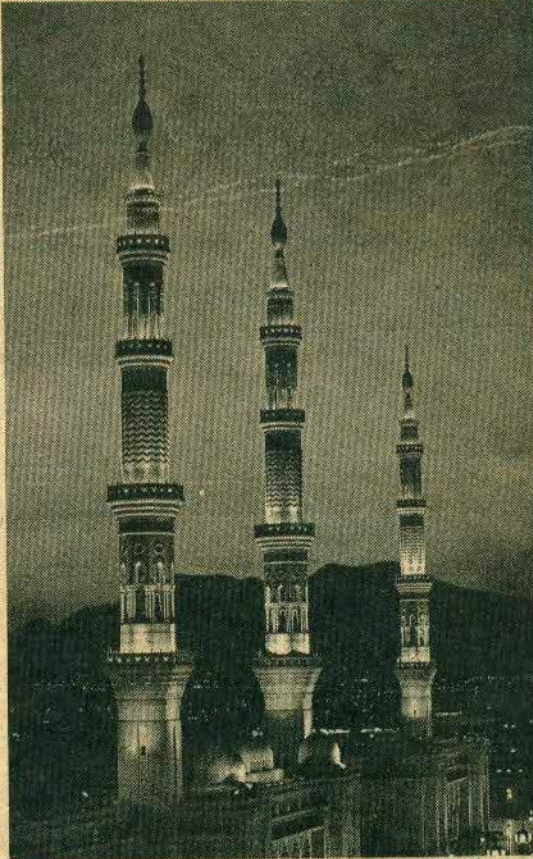
اے خدا کے رسول ۔۔ آپ کا عام امتی جو اب بھی آپ کے دین کی خاطر ہر لمحہ اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہے وہ رہنمائی کی تلاش میں ان ہی اہل تقویٰ کی طرف دیکھتا ہے اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ بڑے بڑے اصحاب کرامت اور حاملین شریعت آپ کے ایجنڈے سے منہ موڑ کر کافر و مشرک سیاسی آقاؤں کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اور برضا و رغبت وہ اس نظام کفر کے بقا و استحکام میں حصہ لے رہے ہیں تو انہیں ایسا لگتا ہے جیسے یہی سب کچھ شریعت کے مطالب ہوں ۔

۔۔ اے خدا کے رسول ۔۔ آپ کا ایک عام امتی سخت ذہنی تشنج کا شکار ہے ۔ کرے تو کیا کرے ؟ دیکھے تو کدھر دیکھے ؟ کوئی پون صدی گزری تب سے اس امت کا کوئی امیر نہیں ۔ خلافت کا شیرازہ منتشر ہے ۔ پوری امت کسی قیادت اور رہنمائی سے یکسر خالی ہے حالانکہ آپ نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے امام عادل کی موجودگی کو لازم قرار دیا تھا اور آپ کے بعد آپ کے لائق خلفاء نے بھی اس امر کے اہتمام میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ خلافت کی کرسی تین دن سے زیادہ خالی نہ رہے ۔ ۔ آپ نے اجتماعی زندگی کی اہمیت بتاتے ہوئے یہ بات بھی کہی تھی کہ جو کوئی نظام امارت سے الگ ہو کر مرا اس نے گویا جہالت میں موت پائی لیکن آج پون صدی ہونے کو آئی ہے لیکن مسلمانوں کی اجتماعی زندگی ہنوز منتشر ہے ۔ بڑے بڑے اہل تقویٰ خلیفۃ المسلمین کی بیعت سے خالی عالم جہالت میں موت کی طرف اپنے قدم بڑھا رہے ہیں ۔ خلافت کا تصور ماند پڑگیا ہے ۔ آپ کی منتشر امت پر اغیار کچھ اس طرح ٹوٹے پڑتے ہیں جیسے یتیم کا مال ہو ۔ ہر کوئی اسے اپنی سمت میں ہانک لے جانا چاہتا ہے ۔ اصل امارت کے خاتمے اور خلیفۃ المسلمین کے غیاب کا نتیجہ یہ ہے کہ امت میں بہت سی امارتیں وجود میں آگئی ہیں ۔ ہر مدعی جو امارت کا دعویدار ہے اور ان امراء میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کافر و مشرک سیاسی آقاؤں کے ہاتھوں بیعت نہ کر رکھی ہو ۔

کتنی تکلیف دہ ہے یہ صورت حال ۔۔ اے خدا کے رسول ۔۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے ۔ ایک مہیب تاریکی ہمارے ملی وجود کو مسلسل اپنی گرفت میں لیتی جارہی ہے ۔ سرنگ کے دوسری طرف روشنی کا فقدان ہمیں اذیت ناک مایوسی اور ہلا دینے والی بے بسی سے دوچار کر دیتا ہے ۔ ہمیں ہر لمحہ ایسا لگتا ہے کہ شاید حالات کی درستگی اب انسانی فہم و فراست سے باہر ہے ۔ ایسی سنگین صورت حال میں ہم جیسے ٹوٹے پھوٹے نفوس کے لئے کوئی راستہ بنانا یقیناً آسان نہیں ۔

ہاں اگر کوئی امید ہے تو اس ذات بزرگ و برتر سے جو یقیناً آپ کی امت کو ہند کی سرزمین میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ آج اگر یہ مٹھی بھر لوگ مٹا دیئے گئے تو آنے والے دنوں میں سرزمین ہند آخری رسول کی امت سے خالی ہو جائے گی ۔ اے خدا کے رسول! اب اگر کوئی امید ہے تو اسی ذات باری سے جو آپ پر خصوصیت کے ساتھ فضل فرماتا ہے اور جس کی نصرت کے بھروسے ہم نے اپنی امیدوں کا پتوار ابھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے ۔ اب دیر نہ کیجئے ۔ اے خدا کے رسول! اب ہاتھ اٹھا بھی دیجئے ۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے ہیں

مسلم نفسیات پر پڑنے والے اثرات کا ایک جائزہ

دہلی میں بھاجپا کے اقتدار کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن اس مختصر سے عرصے میں ہندوستانی مسلمانوں پر جو ذہنی اور نفسیاتی کیفیت گزری ہے اس سے اس بات کا واضح اندازہ ہونے لگا ہے کہ اب ان کی ہمت جواب دیتی جارہی ہے۔ حوصلے پست ہو رہے ہیں، ولولوں میں وہ تازگی نہیں اور دشمنوں کے مقابلے کا پہلا سا وہ کس بل نہیں رہا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پوری امت خود کو بے یار و مددگار پاکر اپنے آپ کو دشمنوں کے سپرد کر رہی ہو۔ زندگی کے بقیہ دن وہ ان ہی دشمنوں کے رحم و کرم پر جینا چاہتی ہے۔

عام مسلمانوں کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ ان کے کھلے دشمن اب دہلی کے اقتدار پر قابض ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں کے علاوہ سب سے بڑی ریاست اتر پردیش بھی ان کے حکمرانی میں ہے۔ اتر پردیش کو اس اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں اہمیت حاصل ہے کہ یہاں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک چوتھائی آبادی آباد ہے۔ اس لئے اس خطے میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے اثرات پوری ملی زندگی پر محسوس کئے جاتے ہیں۔ ایک ایسی صورت میں جب دشمن کو لکھنؤ سے دلی تک سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دکھانے کا اختیار حاصل ہو گیا ہو اور جب بے بس مسلمانوں کے سیاسی آقاؤں اور نامراد مسیحاؤں کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگ ڈور پھسل گئی ہو، ان کے لئے مایوسی اور احساس شکست میں مبتلا ہو جانا عین فطری ہے۔

دریں اثنای بی جے پی کے خفیہ ایجنڈے کی بات بھی مسلمانوں کو پریشان کرتی رہی ہے۔ عام مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ کل تک جو لوگ بابری مسجد کی مسماری کی تحریک چلاتے تھے اور جن لوگوں نے انہدام کا تمغہ امتیاز اپنے سینوں پر سجا رکھا تھا آج وہ حکومت میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ اب جب وہ بااختیار ہیں مسلمانوں کے خلاف اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کیا کچھ نہ کریں گے۔ ادھر بی جے پی نے اپنے تنظیمی اجتماعات میں بھی اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ وہ اقتدار کی خاطر اپنے اصل موقف سے دستبردار نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ہے اور چونکہ اہل حکومت کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں اس لئے جو کام بی جے پی کی حکومتیں انجام نہیں دے پا رہی ہیں انہیں بی جے پی کا تنظیمی ڈھانچہ انجام دے گا۔ گویا اصل کام تو حکومت سے باہر بی جے پی کے کارکنوں کو انجام دینا ہے۔ ان کی حکومتیں ہر سطح پر کارکنوں کو ضروری امداد اور سہولتیں فراہم کرتی رہیں گی۔

اخبارات میں یہ خبر بھی گشت کر رہی ہے کہ اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ پتھروں کی تراش خراش کا کام چل رہا ہے۔ تعمیر میں کام آنے والی چیزیں اکٹھا کی جارہی ہیں بس ایک مناسب وقت کا انتظار ہے۔ گویا ہر سطح پر مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اب وہ پوری طرح ایک دشمن حکومت کے نرغے میں ہیں۔ ان کا مستقبل ان ہی حکمرانوں کے رحم و کرم پر ہے جنہیں وہ اب تک اپنا دشمن نمبر ایک تسلیم کرتے رہے ہیں اور جنہیں انتخابات میں شکست دینے کے لئے مسلمان ان کی مخالفت میں ووٹ ڈالتے رہے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ایک مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اب وہ جائیں تو جائیں کہاں؟ مدد کس سے مانگیں؟ منصفی کس سے چاہیں؟ کل تک ہمارے ملی بزرگ اور بزرگ دینی شخصیات حکمرانوں سے کم از کم اس حوالے سے گفتگو کرلیا کرتے تھے کہ حضور ہم آپ کے پرانے بہی خواہ ہیں۔ ہم نے تو آپ کے دادا موتی لال نہرو کا چہرہ بھی دیکھا ہے اور آپ کے والد جواہر لال نہرو سے بھی ہماری سلام دعا رہی ہے پھر عجب نہیں کہ آپ ہم پر اتنا کرم نہ کریں کہ ان معروضات کو سن لیں جو ہم مسلمانوں کی طرف سے آپ کے پاس لے کر آئے ہیں۔ یہی دلیل راجیو گاندھی کے زمانے میں بھی کارگر تھی اور جب نرسمہا راؤ وزارت عظمی کی کرسی پر بیٹھ گئے تو ان کو بھی احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ آپ اس کانگریس کے سربراہ ہیں جس نے ملک کو آزادی دلائی ہے اور جس میں مسلمانوں کی قربانیوں کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو پرانی وفاداریوں کے طفیل اتنی تو

وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے نئے حالات کے لئے باحوصلہ منصوبے ترتیب دیں اور امت کو یہ باور کرائیں کہ ان کی حفاظت کا کام حکمرانوں کے ذریعے نہیں بلکہ اللہ کی نصرت کے سہارے خود ان کی اپنی کوششوں سے انجام پائے گا۔

ضمانت دے دیں کہ ہماری مسجد اس ملک میں محفوظ رہے۔

مشکل یہ ہے کہ اب جو لوگ برسراقتدار ہیں ان سے پرانے طرز میں کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ فدویانہ التجاؤں کا سابق انداز اب اچانک بے محل ہوگیا ہے اس لئے مسلمانوں کی قیادت کو یہ مشکل پیش آرہی ہے کہ اب وہ نئے حالات میں کفار و مشرکین سے عرض گزاری کریں تو اس کی بنیاد کیا ہو؟ اب مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں اولا وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے نئے حالات کے لئے باحوصلہ منصوبے ترتیب دیں اور جمہور امت کو یہ باور کرائیں کہ ان کی حفاظت کا کام حکمرانوں کے ذریعے نہیں بلکہ اللہ کی نصرت کے سہارے خود ان کی اپنی کوششوں سے انجام پائے گا۔ وہ کہیں عرض گزارنے کے بجائے خود اپنی بنیادوں پر حالات کو بدل ڈالنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ہر فیصلہ کن گھڑی میں اللہ کی غیر معمولی حمایت حاصل رہے گی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ سابقہ بزدلانہ رویے کو ذرا توسیع دے کر مسلم قائدین بی جے پی سے معافی تلافی کرلیں اور یہ بتائیں کہ حضور ہم سے غلطی ہوئی تھی، ہم تو خواہ مخواہ کانگریس اور دوسری جماعتوں کو اپنا مسیحا سمجھ بیٹھے تھے۔ حالانکہ مسیحائی کا کام تو آپ لوگ بھی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ دیکھئے ذرا ہمارے مدارس کے بارے میں کچھ نہ کہئے، پرسنل لاء کو ہاتھ نہ لگایئے اور وقتاً فوقتاً ہمارا دل جیتنے کے لئے کچھ امید افزاء باتیں کرتے رہئے پھر ہم آپ کے ساتھ ہیں، ہمارا ووٹ ہی کیا دل و جان اور ایمان سب آپ کے لیے حاضر ہے۔

مسلمانان ہند کے لئے اس وقت یہی دو راستے ہیں۔ پہلے رویے میں ایک چیلنج ہے جس کو قبول کرنے کا دم خم اس وقت مشکل ہی سے نظر آتا ہے البتہ ایک بڑی تعداد دوسرے رویے کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

دہلی میں بھاجپائیوں کے برسراقتدار آنے کے بعد مسلم تنظیموں، اداروں اور شخصیات کی طرف سے جو بیانات سامنے آئے ہیں اور ملی فرنٹ پر جس نوع کی سرگرمیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں اس سے اس بات کا اندازہ ہورہا ہے کہ ہم دوسرے رویے پر سفر کے آغاز کے لئے ذہنی طور پر تیار ہورہے ہیں۔ گذشتہ دنوں علی گڈھ میں منعقدہ دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ مسلم بچوں کو سرکاری اسکولوں میں سرسوتی کی تصویر کے سامنے قومی ترانہ گانے، بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھانے، اس کی پوجا ارچنا کرنے، وندے ماترم کہنے اور دوپہر کے وقفے میں کھانے کے بعد بھوجن منتر پڑھنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ کونسل کے ذمہ داران نے اس موقع پر جو تجاویز منظور کیں اور جو حل تلاش کیا وہ یہ کہ ان تمام مسائل کے حل کے لئے حکومت سے درخواست کی جائے اور بس، لہذا حکومت سے جی بھر کر یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ ایسا نہ کرے اور ویسا نہ کرے، فلاں حکم کو واپس لے اور فلاں باتوں کو روک دے۔ اب ظاہر ہے کہ جو حکومت ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں میں احساس بے بسی پیدا کرنے کے لئے اس طرح کی اسکیمیں نافذ کررہی ہو بھلا وہ خالی خولی درخواستوں سے ان احکامات کو کیوں کر منسوخ کردے گی؟ اس کا منشاء تو یہی ہے کہ جو مسلمان اب تک اپنے مسائل کے حل کے لئے کانگریسی حکومت کی چوکھٹوں پر سجدے کرتے رہے ہیں وہ اب ہمارے آستانوں پر تعظیم بجالائیں۔ دیکھا جائے تو بی جے پی کے پالیسی ساز مسلمانوں کو اپنے ڈھب پر لانے میں خاصے کامیاب ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں میں یہی تو ہوتا رہا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے لئے مختلف مسائل پیدا کرنے کے بعد مسلم قائدین کے کہنے سننے پر اسے جزوی طور پر واپس لیتی رہی ہے۔ اس طرح مسلمانوں کو بغیر کچھ دیئے دلائے انہیں اپنے اعتماد میں لیا جانا ناممکن رہا ہے۔ بی جے پی کی موجودہ حکومت بھی یہی چاہتی ہے کہ مسلمان اپنی مسیحائی کا ٹھیکہ اب کسی اور پارٹی کے بجائے اسے دے دیں تاکہ وہ بھی سابقہ انداز سے مسلمانوں کی خبرگیری کا فریضہ انجام دیتی رہے۔

علیگڈھ میں میر مجلس مولانا علی میاں نے حکومت کو موجودہ رویے سے باز رکھنے کی جو درخواست کی ہے اس میں چیلنج کا انداز نہیں بلکہ وہی فدویانہ لب و لہجہ نمایاں ہے۔ آپ نے فرمایا "یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لے جانے کا اقدام ہے جس کے تصور سے ایک محب وطن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔" حب الوطنی کی وہی دہائی اور دیش بھگتی کی وہی پرانی باتیں۔ حالانکہ مسلمانوں کو اگر موجودہ سرکاری پالیسی پر کوئی تشویش ہے تو خالص مسلمان کی حیثیت سے۔ ملک جائے یار ہے اصل چیز تو یہ ہے کہ ہمارا ایماں سلامت رہے۔

خطرہ ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں نے پھر وہی درخواست گذاری کا رویہ اختیار کیا اور اپنے امور کی نگہبانی کا کام غیر مسلموں کے سپرد کرکے مطمئن ہوگئے تو آنے والے دنوں میں ان کے زوال کا گراف بہت تیزی کے ساتھ نیچے چلا جائے گا۔

خطرہ ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں نے باقی صفحہ ۱۸ پر

اب کل کبھی نہ آئے گا

دنیا بھر میں قرب قیامت کی تازہ بتازہ پیشین گوئیوں کا ایک جائزہ

صدی کے خاتمے میں اب صرف ڈھائی سال باقی رہ گئے ہیں۔ جیسے جیسے بیسویں صدی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے دنیا بھر میں قرب قیامت کی پیشین گوئیوں کا زور بڑھتا جارہا ہے۔ نئے نئے پیغمبر اور الہام کے دعویدار سامنے آرہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں آپ نے ایک تائیوانی راہب چن ٹاؤ کے بارے میں سنا تھا جسے یہ دعویٰ تھا کہ وہ براہ راست خدا سے کلام کرتا ہے اور جس نے خدا کے اس دنیا میں ظہور کا وقت بھی متعین کر دیا لیکن خدا کو نہ آنا تھا نہ آیا۔
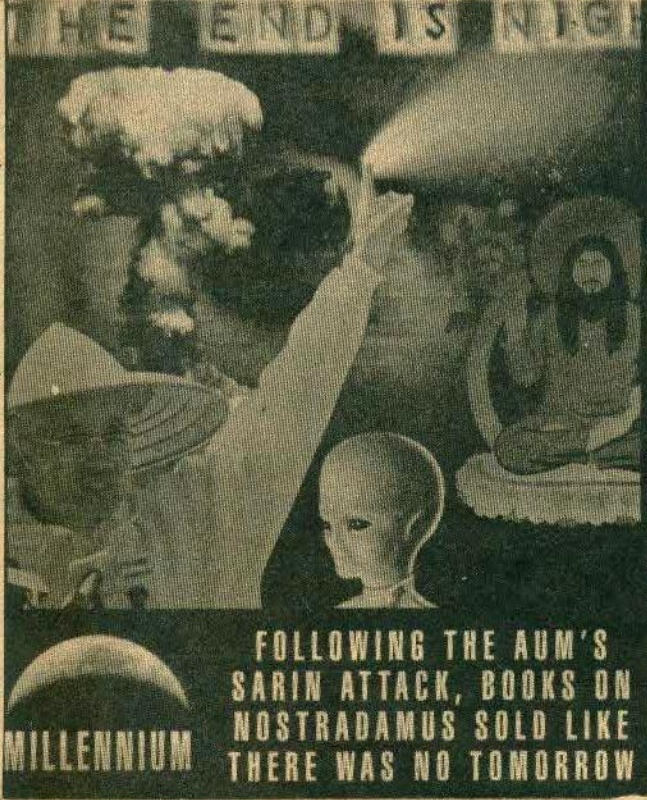
گو کہ جن لوگوں نے اب تک دنیا کے خاتمے کی پیشین گوئی کی ہے ان میں سے بیشتر کے دعوے غلط ثابت ہوئے ہیں لیکن قصہ یہ ہے کہ ہر نیا دعویدار ایک نیا نکتہ سامنے لاتا ہے اور ایک نئی علامت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور چونکہ سال 2000ء کے خاتمے پر عام ذہنوں میں ایک نئی تبدیلی کی امید پائی جاتی ہے اس لیے اکثر لوگ آنے والے ہر نئے پیغمبر کو کسی نہ کسی حد تک معتبر سمجھ کر اس کی حماقتوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ قدیم تاریخی کتابوں میں سال 1000ء کے خاتمے پر بھی کچھ اسی قسم کی حماقتوں کا سراغ ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عیسائی راہبوں نے سال 1000ء کے خاتمے پر یہ پیشین گوئی کر رکھی تھی کہ اس دن پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے، سمندر میں ابال آجائے گا اور اس طرح دنیا اپنے انجام کو جا پہنچے گی۔ دنیا بھر میں لوگ بڑی بے چینی سے خوف و ہراس میں مبتلا اس آخری لمحے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب سال 1000ء کا آخری لمحہ گزر گیا اور کوئی محیر العقول واقعہ سامنے نہ آیا تو عیسائی راہبوں نے یہ کہہ کر تاریخ میں توسیع کر لی کہ دراصل وہ لمحہ سال 1033ء کو سامنے آئے گا اس لیے کہ اسی تاریخ کو حضرت مسیح کی موت کی ہزار سالہ برسی کا دن بھی ہے لیکن تب بھی دنیا اپنی جگہ باقی رہی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب قرب قیامت کی پیشین گوئیاں صرف عیسائی حلقوں سے نہیں ہو رہی ہیں بلکہ بہت سے چھوٹے موٹے گروہ اور روحانیت کے متلاشی دنیا کے خاتمے کی سائنٹفک دلیل فراہم کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور چونکہ مغرب میں زندگی کا مزہ جاتا رہا ہے لوگ روحانی طور پر ناآسودہ اور مادی زندگی کے جبر سے پریشان ہیں اس لیے وہ قیامت کی خبروں کی طرف دوڑے پڑتے ہیں۔ چونکہ موجودہ دور میں قرب قیامت کی پیشین گوئی کرنے والے جدید مواصلاتی سہولتوں سے لیس ہیں اس لیے ان کے لئے پیروکار تلاش کرنا بہت مشکل نہیں ہے۔ انٹرنیٹ پر ان کی سرگرمیاں ملاحظہ کیجئے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان میں سے بہتوں نے منٹ اور سکنڈ کا بھی حساب لگا رکھا ہے اور بعضوں کے پاس اعداد و شمار کی اتنی دلیلیں ہیں کہ آپ کو ان پیشین گوئیوں پر یقین آنے لگتا ہے۔

دیکھا جائے تو سال 1000ء کے خاتمے پر دنیا کو جن جھوٹے پیغمبروں کا سامنا تھا ان کے مقابلے میں ہمارے نئے پیغمبروں میں علم و فضل کی سطح پر خاصہ فرق ہے۔ اب وہ زمانہ گیا جب ایک شخص لاؤڈ اسپیکر لئے یا نقارہ بجاتا ہوا گلیوں اور شاہراہوں میں یہ آواز لگاتا پھرتا تھا کہ لوگو! ہوشیار ہو جاؤ کہ اب دنیا کے خاتمے کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ اب جو لوگ میدان میں ہیں وہ کمپیوٹر اسکرین پر آپ کو چلتے پھرتے اشیاء کی مدد سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دیکھو وہ آسمانی تخت کس طرح رفتہ رفتہ زمین کے قریب آرہا

ہے جس پر خدا اپنے مقربین کو بٹھاکر آسمان کی طرف لے جائے گا اور یہی وہ لوگ ہوں گے جنہیں واقعی نجات کا حقدار کہا جاسکے گا۔ گذشتہ سال کیلی فورنیا میں جن چالیس لوگوں نے خودکشی کی وہ کمپیوٹر اسکرین پر ایک ایسے سیارے کو دیکھ رہے تھے جو رفتہ رفتہ اس غرض سے زمین کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ ان کی روحوں کو آسمان کی طرف لے جائے۔ دروازہ بہشت کے منتظر ان حضرات کو یہ یقین تھا کہ جو آسمانی تخت زمین کی طرف اتر رہا ہے وہ دراصل ان کی پاکیزہ روحوں کو آسمان پر لانے کے لیے بھیجا گیا ہے اور چونکہ وہ اس موقع کو کھونا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے سامان سفر باندھ کر اجتماعی طور پر خودکشی کرلی۔ پچھلے دنوں چن ٹاؤ نے خدا کی آمد کا جو مژدہ سنایا تھا اس نے بھی کافی بڑی تعداد میں لوگوں کو متاثر کیا یہاں تک کہ ڈیڑھ سو وگ اپنا کاروبار زندگی سمیٹ کر، گھر بار بیچ کر خدا کے دیدار کے لئے امریکہ پہنچ گئے۔

آخر کچھ تو ہے کہ لوگ اپنا سب کچھ لپیٹ کر قیامت کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاید یہ چند منحرف لوگوں کا قافلہ ہے جو نفسیاتی امراض اور ذاتی مسائل کی وجہ سے دنیا کے خاتمے کا انتظار کررہے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ آج مغرب کے معاشرے میں اس قسم کے خیالات کو تیزی سے مقبولیت مل رہی ہے۔ دیکھا جائے تو قیامت کے منتظرین ہم اور آپ جیسے عام لوگ ہیں۔ مغرب ہی کیا مشرق کے معاشروں میں بھی جہاں مادی زندگی کا دباؤ بڑھتا جارہا ہے اور جہاں عام انسان روٹی کی دوڑ دھوپ میں صبح شام کولہو کے بیل کی طرح جتا ہوا ہے وہاں دنیا کے خاتمے میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اور اس طرح کے جھوٹے پیغمبروں کے پیروکاروں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب جاپان میں ایک مذہبی گروہ نے زہریلی گیس کے ذریعے دنیا کی تباہی کا تجزیہ کیا تو اس وقت مستقبل کے سلسلے میں لوگوں کی دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ نوٹرے ڈیم اور اس جیسی کتابیں اتنی تیزی سے فروخت ہوئیں کہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کل صبح ہی قیامت آنے والی ہے اور پڑھنے والوں کے پاس آج ہی کا وقت باقی ہے۔ امریکہ میں ایک سروے کے ذریعے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہاں کی پچاس فیصد آبادی اڑن طشتریوں میں یقین رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ناولوں میں غیر مرئی مخلوق کے ذریعے انسانوں کے اغوا کے واردات درج کئے جاتے ہیں وہ آنا فانا اسٹال سے غائب ہوجاتی ہیں اسی طرح جن فلموں میں غیر مرئی مخلوق اور پراسرار قوتوں کا تذکرہ ہوتا ہے وہ مقبول ترین فلمیں شمار کی جاتی ہیں۔ فلم انڈپینڈینس ڈے کی کامیابی کی یہی وجہ بتائی جاتی ہے اور جن لوگوں نے آسمانی تخت کی آمد کی امید میں خودکشی کی تھی وہ بھی اسٹار ٹریک اور ایکس فائلس نامی فلموں کا بار بار تذکرہ کرتے تھے۔

مغرب ہی کیا مشرق کے معاشروں میں بھی جہاں مادی زندگی کا دباؤ بڑھتا جارہا ہے اور جہاں عام انسان روٹی کی دوڑ دھوپ میں صبح شام کولہو کے بیل کی طرح جتا ہوا ہے وہاں دنیا کے خاتمے میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اور اس طرح کے جھوٹے پیغمبروں کے پیروکاروں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

عہد جدید کے جھوٹے پیغمبروں کو کمپیوٹر کے علاوہ رقص و موسیقی کے استعمال کی بھی سہولت حاصل ہے لہذا انہوں نے مغرب کے ان تمام ثقافتی وسائل کو استعمال کیا ہے جس میں انسانی حواس کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے۔ کہیں ہاؤ ہو کا ہنگامہ ہے تو کہیں اس دبی کچلی زندگی سے نکال کر دروازہ بہشت تک پہنچانے کا وعدہ اور کہیں خود خدا سے ملاقات کی امید۔ انٹرنیٹ پر ان جھوٹے پیغمبروں کے پیغامات ہر لحہ موجود ہیں جسے بڑے ذوق و شوق سے عام لوگ پڑھ رہے ہیں۔ جدید سائنس نے جن توہمات سے انسانی ذہن کو آزادی دلانے کا بیڑہ اٹھایا تھا اب وہی سائنس توہمات کو پھیلانے کے لئے استعمال ہورہی ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ آنے والے دنوں میں دنیا کے رنگ و بو میں کوئی فرق واقع ہوگا یا واقعی ایسا ممکن ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں دنیا کی سرگرمیوں سے الگ ہوکر قیامت کا انتظار کرنے لگیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ بہت سے لوگ بڑی دلچسپی سے 31 دسمبر 1999ء کا انتظار کررہے ہیں جو ان کے خیال میں اس سرزمین پر زندگی کا آخری دن ہوگا۔ ان کے اس خیال کو اس بات سے مزید تقویت ملی ہے کہ اگر کمپیوٹر کے موجودہ نظام کو جدید نہ بنایا گیا تو 31 دسمبر 1999ء کو دنیا کے بیشتر اہم کمپیوٹر کام کرنا بند کردیں گے اور چونکہ فی زمانہ پوری دنیا کمپیوٹر کے ستون پر کھڑی ہوئی ہے اس لیے اگر ایسا ہوا تو بذات خود یہ سب کچھ کسی قیامت سے کم نہ ہوگا۔ □

بقیہ: رشدی کے بعد اب ایک نیا فتنہ

پیغمبر اسلام کی ازواج مطہرات کے بارے میں بعض ایسے خیالات کے اظہار کے لیے جس کا کوئی یقین نہ کرے گا کہ وہ باتیں اس کی طرف سے کہی گئی ہیں اسے غلط سمجھا جاتا ہے۔ انہی خیالات کے حوالے سے فاطمہ کا حجاب بھی تنازع کا موضوع بن جاتا ہے۔ برڈس فورڈ کے شہری جو جمال کو لعنت ملامت کرتے ہیں وہی زبان بولتے ہیں جس پر کیٹ کو پوری مہارت ہے۔ برڈس فورڈ والے اس خیالی شہر کے باشندوں کی زبان میں خود اپنے الفاظ کی بازگشت سن سکتے ہیں۔

(خیالی شہر کی طرح) اس ناول کا ناشر بھی خیالی ہے یعنی کیٹ نے اپنا اشاعتی نام Totbridown books رکھا ہے۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ...

مولانا علی میاں کے حالیہ فرمودات اور ان کے مضمرات کا ایک جائزہ

گذشتہ پچاس برسوں سے ہندوستانی مسلمان جس فکری ارتداد کے نرغے میں ہیں اس کی اساس جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد کے ارکان ثلاثہ پر رکھی گئی ہے۔ ان اجنبی خیالات اور غیر اسلامی تصورات سے ہماری مانوسیت کا عالم یہ ہے کہ اب عام مسلمان خود کو جمہوریت اور سیکولرزم کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرنے اور اہنسا کے گاندھی بھگتوں میں اپنا شمار کروانا قابل فخر سمجھتا ہے۔ گذشتہ پچاس سالوں سے ان خیالات کو ہماری مذہبی، ملی اور سیاسی قیادت نے کچھ اس طرح قابل قبول بنا کر پیش کیا ہے کہ اب یہ سب کچھ ہمارے لیے عین اسلامی عقیدے کا جز معلوم ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس ملک میں اسلامی عقیدے اور تصورات کا محافظ اور امین سمجھا جاتا ہے اور جن سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ عامۃ المسلمین کی فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیں گے اب ان مبارک زبانوں سے بھی ان اجنبی تصورات کی تبلیغ و ترغیب کی جانے لگی ہے۔ گذشتہ دنوں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک اجلاس سے اختتامی کلمات کہتے ہوئے بورڈ کے صدر مولانا علی میاں ندوی نے ان غیر اسلامی اجنبی تصورات کو جس طرح قبولیت کی سند عطا کی ہے اس سے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے سلسلے میں بعض حساس اور سنگین سوالات پیدا ہوگئے ہیں اور یہ خطرہ بھی پیدا ہو چلا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بطل جلیل کی فکری لغزشوں کی اگر بروقت نشاندہی نہ کی گئی تو ہندوستانی مسلمانوں کا قافلہ ایک ایسی سمت میں جا نکلے گا جو اللہ اور اس کے رسول کی متعین کردہ سمت سے عین مختلف ہے۔

علی میاں نے اپنے اختتامی خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ اس ملک کا مستقبل جمہوری، لامذہبی اور اہنسا کے اصولوں سے وابستہ ہے اور اس عزم کا اعادہ کیا کہ بورڈ کی قیادت اس ملک میں ان اقدار کی بحالی اور ان کے قیام کی ہر ممکن کوشش جاری رکھے گی۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ "اس ملک کی بقا کے لیے یہاں کے بزرگوں نے اس کو ضروری سمجھا کہ یہ ملک جمہوری، لامذہبی اور غیر متشدد ہو یہ طے کرنا ایک الہامی بات تھی"۔ گویا حضرت مولانا کے بقول کفار و مشرکین کے جتھے نے اس ملک کے لیے جو بنیادی خطوط طے کئے تھے وہ ان کے اپنے دماغ کی اپج نہ تھی بلکہ ایک الہامی بات تھی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی چیز اپنا تعلق آسمانی رشتے سے جوڑ لیتی ہے تو اس میں ایک تقدس کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اہل ایمان کو یہ حق نہیں رہتا کہ کسی الہامی خیال کی مخالفت کریں یا اسے بروئے کار لانے میں پس و پیش سے کام لیں۔ اجنبی اور غیر اسلامی خیالات کو الہامی بات کہہ کر علی میاں صاحب نے ایک ایسی سنگین غلطی کا ارتکاب کیا ہے جس کی تلافی کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ فوراً اس قسم کے خیالات سے رجوع کر لیں اور ہندوستانی مسلمانوں کو صاف الفاظ میں بتا دیں کہ جن لوگوں نے اس ملک کو سیکولر ڈیموکریسی کے راستے پر ڈالا تھا وہ اسلامی ہدایت سے ناآشنا اور قرآنی احکامات سے نابلد اللہ اور اس کے رسول کے باغیوں کا ایک ٹولہ تھا جس نے محض اپنے دماغ کی اپج سے ایک ایسی شریعت ایجاد کی جسے سیکولر ڈیموکریسی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جو لوگ الٰہی شریعت کی موجودگی میں کوئی نئی شریعت ایجاد کریں وہ شیطانی وسوسے سے تو تحریک پا سکتے ہیں البتہ ان کا تعلق الہام اور آسمانوں سے نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ خیال کہ اس ملک کا موجودہ جمہوری سیکولر راستہ ایک الہامی راستہ ہے ایک گمراہ کن خیال ہے، انتہائی لغو بات ہے۔ ہمارے لیے الہام کی سرحد اللہ کی آخری ہدایت اور آخری رسول کے اسوہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ سب خرافات ہے، گمرہی ہے، انسانی ذہن کی اپنی اپج ہے۔ اسے الہامی باور کرانا اور ان باتوں میں آسمانی تقدس کا پرتو دیکھنا سنگین جرم ہے جس سے خطرہ ہے کہ اگر کتاب و سنت کے علاوہ کسی اور بات کو تقدس کا درجہ عطا کر دیا گیا تو پوری امت قرآنی ایجنڈے کو فراموش کرکے ایسے راستے پر جا نکلے گی جہاں دنیا و آخرت دونوں کی تباہی اس کا مقدر ہے۔

یہ تو ایک شرعی نکتہ تھا اس سے یقیناً ہم سے کہیں زیادہ حضرت مولانا خود

"اس ملک کی بقا کے لیے یہاں کے بزرگوں نے اس کو ضروری سمجھا کہ یہ ملک جمہوری، نامذہبی اور غیر متشدد ہو یہ طے کرنا ایک الہامی بات تھی "گویا حضرت مولانا کے بقول کفار و مشرکین کے جمگھٹے نے اس ملک کے لیے جو بنیادی خطوط طے کئے تھے وہ ان کے اپنے دماغ کی اپج نہ تھی بلکہ ایک الہامی بات تھی۔

واقف ہیں البتہ چونکہ اسلام نے دین کے معاملے میں نصح خیر خواہی اور تنقید و تلقین کو بزرگی اور شخصی وقار پر مقدم جانا ہے اس لیے ہم نے مولانائے محترم کی ایک لغزش کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا، مبادا پوری امت اس راستے پر نہ چل نکلے۔ اب آیئے اس امر کا جائزہ لیں کہ اس ملک کی بقا کے لیے یہاں کے بزرگوں نے جن بنیادی اقدار کا تعین ضروری سمجھا تھا وہ امت کے مستقبل کی ضمانت دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ خود یہ بزرگ ہمارے لیے لائق اتباع ہیں یا ہم خواہ مخواہ تاریخی جبر کے تحت ایسا کہنے پر مجبور ہیں۔ گاندھی، نہرو، آزاد اور پٹیل ان میں سے کس کی فہم اور کس کی بصیرت کو ہم اس قابل سمجھتے ہیں کہ آج پچاس سال بعد بھی اسے اپنے لیے نشان راہ بنائیں؟ یہ بزرگ اپنے ذاتی اوصاف کی وجہ سے اور بعض شخصی خوبیوں کی وجہ سے خواہ کتنے ہی لائق احترام کیوں نہ ہوں کیا انھیں یا ان جیسے درجنوں قائدین کے مجموعے کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسوہ بتایا جاسکتا ہے؟ یہ تمام کے تمام لوگ خواہ ان کا تعلق کسی بھی ملت سے ہو کیا اس جرم میں برابر کے شریک نہیں ہیں کہ ان حضرات نے نئے ہندوستان کی تعمیر میں آسمانی شریعت سے منہ موڑ کر شریعت جمہور کے ذریعے اس ملک کا کاروبار چلانے کا فیصلہ کیا؟ یقیناً اسے اسلامی شریعت میں ایک ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ "ومن لم یحکم بما انزل الیھم فاولئک ھم الکافرون" پھر ان حضرات کو بزرگوں کا سا تقدس دینا اور ان کی باتوں میں مستقبل کے لیے راستہ تلاش کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ رہی یہ بات کہ اس ملک کا مستقبل اور اس ملک کے مسلمانوں کا مستقبل اس بات میں پوشیدہ ہے کہ یہاں جمہوریت اور نامذہبیت کو فروغ ہو تو ہم بصد احترام یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں پر گذشتہ پچاس برسوں سے جو قیامت برپا ہے وہ اسی جمہوری اور نامذہبی نظام کی برکت ہے اور آج جو لوگ علی الاعلان اس ملک میں ہندو نظام کے قیام کی باتیں کررہے ہیں وہ بھی اسی جمہوریت کی سیڑھی سے وزارت عظمی کی کرسی تک پہنچے ہیں۔ اگر آپ بیج دیکھ کر اس زہریلے پودے کی خطرناکی کا اندازہ نہیں کرپائے تھے تو اب کم از کم اس کا پھل چکھ کر اس کی اصل نوعیت کا ادراک ہوجانا چاہیے، پھر بھی اگر آپ جمہوریت اور سیکولرزم میں امت کا مستقبل دیکھتے ہیں اور ہندوستانی

کو اسی پٹے راستے پر لے چلنا چاہتے ہیں تو خوب لے جایئے کہ یقیناً ہر شخص کو اس دنیا میں عمل کا حق حاصل ہے لیکن اسے الہامی بات تو نہ بتایئے۔

مروجہ جمہوریت اور سیکولرزم خواہ کسی کو کتنی ہی مقدس اور الہامی کیوں نہ لگے ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان تصورات کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام کسی ایسی جمہوریت کا قائل نہیں جس میں قانون سازی کا حق بندوں کو دے دیا گیا ہو۔ قانون سازی صرف اللہ کا حق ہے اور یہ کہ شرعی نقطہ نظر سے یہ بات ہرگز جائز نہیں کہ کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ صفات ربوبیت پر قبضہ کرلے۔ اسلام امور زندگی میں شورائیت کا قائل ہے۔ جمہوریت کا قائل نہیں۔ رہی یہ بات کہ نامذہبیت یا سیکولرزم شریعت کی رو سے ہمارے لیے قابل قبول ہوسکتی ہے یا نہیں تو اس بات سے دین کی معمولی شد بد رکھنے والا آدمی بھی واقف ہے کہ اسلام کسی ایسے نظام کا قائل نہیں جہاں شریعت کی ہدایات کو صرف مساجد کی چہار دیواریوں تک محدود کردیا گیا ہو۔ مسجد میں تو اللہ کے احکام و فرامین جاری ہوں اور مسجد کے باہر نظام کفر کی حکمرانی چل رہی ہو لہٰذا یہ بات کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی سے اسلام کو بے دخل کردیا جائے ایک اجنبی خیال ہے۔ یہ بھکشوؤں کا دین ایجاد کرلینے کے مترادف ہے۔ تاریخ کے کسی لمحے میں حالات کے جبر کے تحت مسلمانوں کے نزدیک کوئی ایسا نظام قابل انگیز تو ہوسکتا ہے البتہ ہمارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ ہم کسی ایسے نامذہبی اور جمہوری معاشرے کے قیام اور استحکام کو اپنا شعار بنالیں۔

ہماری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ آخر اس ملک میں مسلمانوں کو جمہوریت اور سیکولرزم کی بقا اور استحکام کی اتنی فکر کیوں ہے؟ کیا اللہ اور اس کے رسول نے ان پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے یا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ اسی جمہوریت کے بطن سے مستقبل میں خلافت کا سورج طلوع ہوگا؟ پہلے سوال کا جواب تو یقیناً نفی میں ہے۔ آیئے سوال کے دوسرے حصے کا بھی تجزیہ کیا جائے۔ جمہوریت اپنی تعریف کے اعتبار سے اکثریت کا جبر ہے بھلا یہ کیسی دانش مندی ہے کہ آپ برضا و رغبت ایک ایسے نظام کے استحکام کی تحریک چلا رہے ہیں جس میں آپ پوری طرح اکثریت کے رحم و کرم پر زندہ رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب اکثریت کا ایجنڈا مسلمانوں کے ایجنڈے سے مختلف ہو۔ رہی یہ بات کہ نامذہبیت یا سیکولرزم کوئی قابل عمل تصور ہوسکتا ہے تو یہ بات بھی آپ

مروجہ جمہوریت اور سیکولرزم خواہ کسی کو کتنی ہی مقدس اور الہامی کیوں نہ لگے ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان تصوارات کی اسلام میں کوئی گنجائش نھیں ہے کہ اسلام کسی ایسی جمہوریت کا قائل نہیں جس میں قانون سازی کا حق بندوں کو دے دیا گیا ہو۔

پر واضح ہو چکی ہے کہ گذشتہ پچاس برسوں میں سیکولرزم کے نام پر قومی کلچر، ہندو رسم و رواج اور ثقافت کو فروغ دیا جاتا رہا ہے۔ انسانی زندگی کو مذہب اور ثقافت سے الگ نہیں کیا جاسکتا لہذا اس ملک میں عملی طور پر سیکولرزم کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اکثریت کی ثقافت کو فروغ دیا جائے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مسلمان کسی ایسے معاشرے کے قیام کے لئے یا اس کے استحکام کے لیے کام کریں جس میں وہ پوری طرح خود کو اجنبی محسوس کرتے ہوں؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اجنبی تصورات سے اپنا دامن چھڑا کر خالص اسلامی ایجنڈے کے تحت آخری نبی کی امت کی حیثیت سے اس ملک میں متحرک ہوں۔ ان کا مستقبل نہ تو موجودہ جمہوری نظام میں ہے اور نہ ہی سیکولرزم کا دجل و فریب انھیں پناہ دے سکتا ہے۔ اگر پچاس سالوں کے تجربے کے بعد بھی ہم دوبارہ سیکولرزم کی پناہ گاہوں کی تلاش میں پھرتے رہے تو یہ زمینی حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپانے کے مترادف ہوگا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے جان بوجھ کر اس ملک میں اسلامی ایجنڈے کو منجمد کر رکھا ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمیں اس بات کے کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہئے کہ اس ملک کا مستقبل جمہوری، سیکولر اور اہنسا کے اصولوں میں نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اتباع میں ہے۔ ہندوستان کا عام باسی ہو یا آخری ہدایت کے حاملین ہندوستانی مسلمان سبھوں کے لیے اس ملک میں خوشحال روشن مستقبل کا اگر کوئی واقعی امکان ہے تو اسی راستے پر چل کر۔ رہی موجودہ جمہوریت اور سیکولر قدریں اور اس ملک کا ٹوٹا پھوٹا نظام تو یہ سب ملک کو ایک ارضی جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ایک عام شہری سے کہیں زیادہ ہم آخری رسول کی امت کی حیثیت سے خود کو اس بات کا سزاوار سمجھتے ہیں کہ ملک کے کارواں کا رخ تباہی کے راستے سے ہٹا کر ہدایت اور بشارت کی طرف موڑ دیں خواہ ایسا کرنا کسی کو کتناہی گراں کیوں نہ گزرے۔

جن لوگوں کو یہ اندیشہ ستائے دیتا ہو کہ دستور ہند میں تبدیلیوں کی طرف جو قدم اٹھائے جا رہے ہیں اس سے اس ملک میں اقلیتوں کے لیے آخری پناہ گاہ ہی ختم ہو رہی ہے (جیسا کہ حضرت مولانا نے علیگڈھ میں دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں فرمایا ہے) تو انھیں خوب معلوم ہونا چاہئے کہ جھوٹی پناہ گاہیں مکڑی کے جالوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان ان جھوٹی پناہ گاہوں سے نکل کر خود کو اللہ رب العزت کی پناہ میں دے دیں اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اجنبی تصورات سے دامن چھڑا کر ہم اس ملک میں منجمد اسلامی ایجنڈے کو دوبارہ بروئے کار لانے کے لیے آمادہ ہوں اور اس بات پر ہمارے دل و دماغ مطمئن ہوں کہ صرف اللہ اور اس کے رسول کا بتایا ہوا راستہ مقدس اور الہامی ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ رطب و یابس ہے، خرافات ہے۔ ▭

بقیہ: بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے ہیں

پھر وہی درخواست گزاری کا رویہ اختیار کیا اور اپنے امور کی نگہبانی کا کام غیر مسلموں کے سپرد کر کے مطمئن ہوگئے تو آنے والے دنوں میں ان کے زوال کا گراف بہت تیزی کے ساتھ نیچے چلا جائے گا۔ اس لیے کہ ان کے پاس وہ غیرت نفس بھی نہ ہوگی جو ان کو گاہے بگاہے یہ احساس دلاتی رہے کہ وہ کوئی اور نہیں، آخری رسولؐ کی امت ہیں جو بہت دنوں تک کسی غیر اسلامی نظام میں زندگی نہیں گزار سکتے۔ پھر ان کے اندر سے یہ احساس بھی ختم ہو جائے گا کہ ہندوستان کوئی اور ملک نہیں بلکہ سابق دار الاسلام ہے جسے دوبارہ دار الاسلام بنانے کی ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے۔ گذشتہ دنوں مدارس کے حوالے سے جب ایک ذمہ دار پولیس آفیسر نے یہ بات کہی کہ دینی مدارس پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے اڈے بن گئے ہیں تو ان بے سر پیر کی باتوں کا سختی سے نوٹس لینے اور عدالت میں سخت چارہ جوئی کے بجائے علماء کرام کی طرف سے بڑے فدویانہ انداز سے اس طرح کے بیانات آتے رہے کہ حضور ہم تو دیش بھگت لوگ ہیں۔ دیش کی آزادی میں دیوبند کا حصہ ہے، علماء کی قربانیاں ہیں۔ دیکھئے اتنا ظلم تو نہ کیجئے کہ ہم جیسے بے ضرر لوگوں کو ان خطرناک الزامات سے پریشان ہونا پڑے۔

جدھر دیکھئے فدویانہ عرض گزاری کا وہی انداز ہے۔ اب صرف اشارہ گیا ہے کہ حسب سابق ہندوستانی مسلمانوں کا ملی وفد اور محترم علماء کرام کا کارواں ملت کے تحفظ کا مقدمہ لے کر بنفس نفیس واجپئی جی کے آستانے پر حاضر ہو اور انھیں اپنی خیر خواہی اور وفاداری کا احساس دلا کر ان سے تحفظ کی ضمانت حاصل کرے جیسا کہ ہم سابق حکمرانوں کے دور میں کرتے رہے ہیں لیکن تب ایک اساس موجود تھی کہ ہم آپ کے پرانے غلام ہیں، ہماری آپ سے راہ و رسم بہت پرانی ہے۔ البتہ اب نئی صورت حال میں عرض گزاری کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ آپ ہی جیتے اور ہم ہار گئے۔ ہمیں اپنی شکست تسلیم ہے۔ اب ہم پوری طرح آپ کے رحم و کرم پر ہیں اور آپ ٹھہرے بھلے مانس لوگ تو کم از کم اتنا تو کیجئے کہ ہمیں موت کی سزائیں اچانک نہ دیجئے۔ پچھلی حکومتیں بھی تو قسطوں میں موت بانٹتی رہی ہیں بس آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔ بھلا ہم کوئی زندگی تو نہیں مانگتے پھر آپ کو ہمارا یہ مطالبہ تسلیم کرنے میں کچھ پریشانی نہ ہونی چاہئے۔ ▭

اسلام کی سربلندی کا راز امن مذاکرات میں نہیں

مسئلہ فلسطین نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اصل معرکہ میدانِ جنگ میں برپا ہوگا

فلسطین میں یاسر عرفات کی قیادت میں ایک جزوی خود مختار انتظامیہ کے قیام کے بعد مسلم دنیا میں عام طور پر یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ ان کے مسائل کا حل قوت کے ذریعے نہیں بلکہ پرامن مذاکرات کی میز سے برآمد کیا جاسکتا ہے۔ ابتداء سے امن مذاکرات کو جس طرح بین الاقوامی سطح پر کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی اس سے اس احساس کو مزید تقویت ملی کہ اب جنگ وجدال کے ذریعے ملکوں کی فتوحات کا زمانہ جاچکا ہے اور یہ کہ اب ہاری ہوئی جنگ بھی مذاکرات کی میز پر جیتی جاسکتی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ وہ جب فلسطین کی بازیابی کا حوصلہ ہار چکے تھے اور جس کے لئے ان کی پچاس سالہ مسلح جدوجہد رائگاں گئی اب اسی فلسطین میں محض پرامن مذاکرات کے نتیجے میں ایک فلسطینی انتظامیہ کا قیام ممکن ہوگیا ہے اور یہ کہ اگر مسلمان پرامن بقائے باہم کے اصول کو اپنائیں تو امریکہ رفتہ رفتہ فلسطینیوں کو ان کی بہت سی زمینیں واپس دلاکر ایک خود مختار فلسطینی ریاست کی تشکیل میں مدد دے گا۔ فلسطین میں امن کے راستے کامیابی کے جو مبہم امکانات پیدا ہوچکے تھے اس نے پوری دنیا میں مسلم مفکرین کی موجودہ نسل کو متاثر کیا۔ بہت سے مسلمان جو عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے دنیا بھر میں مختلف سطح پر جدوجہد میں مصروف تھے انہیں دفعتاً ایسا لگا جیسے مستقبل میں نظام اسلامی کے قیام کا راستہ جنگ وجدال اور ٹکراؤ کے راستے میں نہیں بلکہ دشمن سے میٹھی میٹھی خوشگوار ملاقاتوں میں پوشیدہ ہے۔

جب سے اب تک گفت وشنید، تبادلہ خیال، امن مذاکرات جیسے موضوعات پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ مسلم دانشوروں کی ایک ایسی نسل وجود میں آچکی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ دشمن سے مسلح جدوجہد میں اپنی قوت کھپانا حماقت ہے۔ یہ سب پرانے دور کی باتیں ہیں۔ جب مستقبل کا فیصلہ جنگ کے میدان میں ہوا کرتا تھا اب چونکہ تہذیبی ترقی کے نتیجے میں ہم ایک ایسے مقام پر جاپہنچے ہیں جہاں پیار بھرے افہام و تفہیم سے مسئلے کا حل نکالا جاسکتا ہے، دشمن کو دلائل سے زیر کیا جاسکتا اور ظالم کی کلائی مروڑنے کے بجائے اس کی خدمت میں عرض گزاری سے کام چل سکتا ہے یہاں تک کہ مسلمانوں میں اب بعض لوگ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ قرآن میں جہاد کے سلسلے میں جو احکامات نازل ہوئے ہیں وہ دراصل قبائلی زندگی کو خطاب کرتے ہیں۔ رہی ہماری مہذب دنیا تو اب یہاں دشمن سے راست جنگ کے بجائے افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنی ہوگی اور چونکہ بار بار خود دشمن کی طرف سے امن کی پیش کش ہوتی رہتی ہے اس لئے مسلح جدوجہد کے لئے کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ اس خیال کے حاملین یہ بھی کہتے ہیں کہ اب دنیا سکڑتی جارہی ہے۔ ملکوں کی سرحدیں غیر مؤثر ہوگئی ہیں۔ ایک ملک کی ثقافت دوسرے ملک کو متاثر کررہی ہے۔ ایک کی معیشت دوسرے پر اثر انداز ہورہی ہے اور دنیا کے بیشتر حصوں میں مخلوط معاشرے وجود میں آرہے ہیں اس لئے مسلمانوں
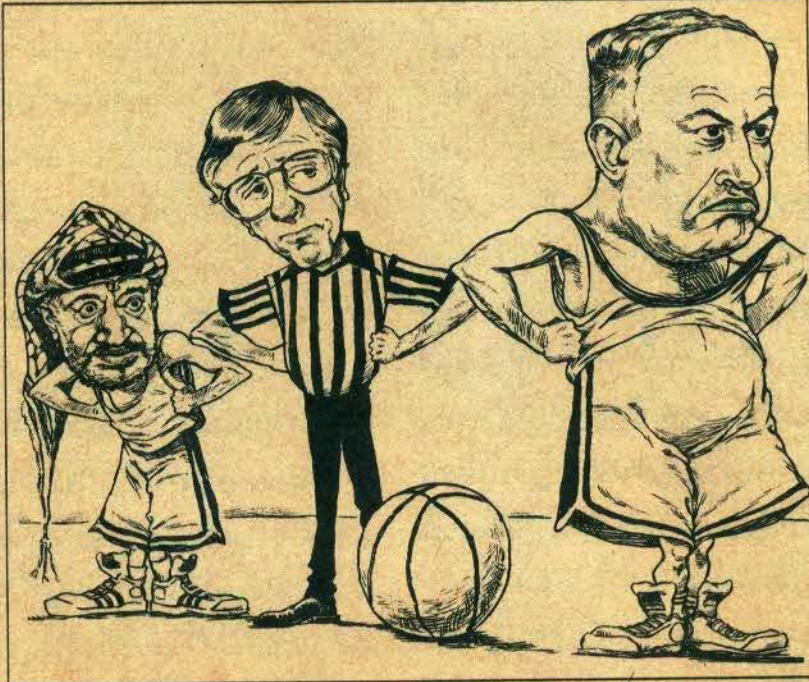
کو اسلامی احکامات کو خالصتاً اسی انداز میں برتنے کا خیال ترک کر دینا چاہئے۔ مسلم دانشوروں کی یہ جدید نسل اب صرف تجدد پسند اور مغرب سے متاثر مسلمانوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اسلامی تنظیموں کے اندر بھی بہت سے دل و دماغ اس طرز فکر سے متاثر ہو چکے ہیں حتیٰ کہ جو تحریکیں نظام اسلامی کے قیام کے لئے اٹھی تھیں اور جو خالص غیر مصالحانہ رویے کی علمبردار تھیں۔ اب ان میں سے اکثر و بیشتر اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ فی زمانہ مسلح جدوجہد یا راست ٹکراؤ کے بجائے گفت و شنید سے ہی اسلامی انقلاب کی منزل طے کی جا سکتی ہے۔ معاصر دانشوروں کو ٹکراؤ کے بجائے افہام و تفہیم کے راستے پر لانے میں ان خیالات کا بھی دخل رہا ہے جن کا پروپیگنڈہ مغرب کے علمی ادارے کرتے رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مغرب اپنی تمام تر اسلام دشمنی کے باوجود علمی سطح پر یہ باور کراتا رہا ہے کہ مغرب میں اسلام کی تفہیم کی حقیقی خواہش کا اظہار بڑھتا جا رہا ہے اور یہ کہ مغربی مفکرین واقعتاً یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام سے ٹکراؤ کی پالیسی ترک کر کے افہام و تفہیم کا راستہ نکالا جا سکتا ہے اور اس میں اسلام کے ساتھ ساتھ خود مغرب کی فلاح کا وافر امکان پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف فرانسس فوکو یاما اور سیمول ہنٹنگٹن اور اس قبیل کے دوسرے دانشوروں نے یہ کہہ کر علمی دنیا کو اپنے سر پر اٹھالیا کہ اب دنیا کی قسمت کا فیصلہ تہذیبی محاذ پر ہوگا اور یہ کہ مستقبل کی جنگ ایک تہذیبی جنگ ہوگی جس میں فاتح تہذیب عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہو جائے گی۔ مغرب میں تہذیبی جنگ کی بحث نے اتنی گرد اٹھائی کہ بڑے بڑے اہل دانش اس علمی بحث کے پس پشت پروپیگنڈہ عناصر کی صحیح تفہیم سے قاصر رہے۔ ان علمی مباحث سے ایک عمومی تاثر یہ پیدا ہوا کہ دنیا کے مستقبل سازوں کو اب آنے والے تہذیبی میدان میں اپنی برتری کے اظہار کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مغرب چونکہ فی زمانہ ایک غالب تہذیب کی حیثیت سے دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے اور موجودہ دنیا میں ثقافتی برتری کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے اس پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔ کمزور، بے بس اور مغلوب قوموں کے لئے غالب قوتوں کو تہذیبی سطح پر مات دینا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ گویا مغرب نے ایک ایسے محاذ پر مسلمانوں کو مقابلے کی دعوت دی جہاں اس کی قوت مسلم ہے۔ جو لوگ قوت

بہت سے مسلمان جو عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے دنیا بھر میں مختلف سطح پر جدوجہد میں مصروف تھے انہیں دفعتاً ایسا لگا جیسے مستقبل میں نظام اسلامی کے قیام کا راستہ جنگ و جدال اور ٹکراؤ کے راستے میں نہیں بلکہ دشمن سے میٹھی میٹھی خوشگوار ملاقاتوں میں پوشیدہ ہے۔

جب سے فلسطینی انتظامیہ وجود میں آئی ہے حماس کے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کا کام آسان ہوگیا ہے اس لئے کہ فلسطین انتظامیہ ان ٹھکانوں پر بآسانی پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اسرائیل سے مخبروں کا پہنچنا ممکن نہ تھا گویا اسرائیل نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لاکھڑا کیا ہے۔

کے میزانیے کی ترکیب و تشکیل کے فن سے واقف ہیں اور جنہیں مختصر قوت کو کسی مستحکم نظام کے خلاف برتنے کا تھوڑا بہت بھی سلیقہ آتا ہے وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ دشمن کو مبارزت اس محاذ پر دی جاتی ہے جہاں وہ کمزور ہو۔

ایک طرف امریکہ کی قیام امن کی کوشش، فلسطین کو مذاکرات کی میز سے آزاد کرانے کا مصنوعی ڈرامہ اور دوسری طرف علمی اسالیب میں مستقبل کی جنگ کے تہذیبی محاذ پر برپا ہونے کا پروپیگنڈہ ان باتوں سے مسلمانوں کے دردمند اہل فکر بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر امن مذاکرات سے فلسطین کی بازیابی ممکن ہے تو یقیناً اس مہذب دنیا میں ہمیں تصادم کا راستہ ترک کر دینا چاہئے اس لئے کہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں۔ ان کے اندر مقابلے کی قوت نہیں، پھر جو لوگ تصادم کی صعوبتوں سے واقف تھے اور جنھوں نے اپنا بہت کچھ اس راستے میں گنوایا تھا۔ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر کوئی چیز امن کے راستے سے مل رہی ہے تو اسے جنگ کے راستے حاصل کرنے پر ہی کیوں زور دیا جائے؟ اول اول تو یاسر عرفات کی امن کوششوں کو مسلمانوں نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا لیکن رفتہ رفتہ فلسطینی انتظامیہ کے قیام کے بعد ان کوششوں کے سلسلے میں مسلمانوں کا رویہ نرم ہوتا گیا۔ امن ایک خوش کن لفظ تھا جس کی زہرناکی کا اندازہ کئے بغیر مسلمانوں کی بڑی تعداد نے اسے نگلنے میں عافیت جانی۔

البتہ اب جب فلسطین انتظامیہ کے قیام کو چند سال گزر چکے ہیں اور اس عرصے میں قیام امن کے لئے اسرائیل کی جانب سے کئے گئے تمام وعدے سراب ثابت ہو رہے ہیں، امریکہ بار بار اسرائیلی اور فلسطینی نمائندوں کو مذاکرات کی میز پر بٹھانے کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد کرنے میں ناکام ہو رہا ہے اور جب اسرائیل فلسطین انتظامیہ کو نہ تو مزید علاقے دینے پر آمادہ ہے اور نہ ہی ان علاقوں سے اپنی فوجی چوکیاں ہٹانا چاہتا ہے تو دنیا بھر میں امن کے حامی مسلم مفکرین کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہونے لگا ہے کہ امن کے ذریعے میدان مار لینے کا خیال ایک مغالطہ تو نہیں تھا۔ اب مسلم حلقوں میں یہ سوال بھی پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا اسرائیل واقعی امن چاہتا ہے اور وہ ایک خود مختار فلسطینی حکومت کے قیام میں واقعی سنجیدہ ہے؟

اس لئے کہ اب تک اسرائیل نے قیام امن کے نام پر جو کچھ بھی کیا ہے اس میں فلسطینیوں سے کہیں زیادہ خود اسرائیلی حکومتوں کو فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ اولا فلسطینی انتظامیہ کے قیام سے ایک طرف تو دنیا بھر میں اسرائیل کی امن خواہش کا پروپیگنڈہ ہوا ہے اور دوسری طرف فلسطین کے غیور مسلم نوجوانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یاسر عرفات کی ذات میں ایک ایسا شخص ہاتھ آگیا ہے جو اپنے ہم وطنوں کی کمزوریوں اور خوبیوں سے خوب واقف ہے اور جسے اسرائیل مخالف متشدد نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کا فن خوب آتا ہے۔ جب سے فلسطینی انتظامیہ وجود میں آئی ہے حماس کے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کا کام آسان ہوگیا ہے اس لئے کہ فلسطینی انتظامیہ ان ٹھکانوں پر بآسانی پہنچ جاتی ہے جہاں اسرائیل کے مخبروں کا پہنچنا ممکن نہ تھا گویا اسرائیل نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لاکھڑا کیا ہے۔ جن نوجوانوں کی کنکڑیوں پر قابو پانا اس کے بس میں نہ تھا اب یہ کام اس نے یاسر عرفات کو سونپ دیا ہے۔ حماس سے چونکہ مصالحت کا کوئی امکان نہ تھا اور اسرائیل مسلمانوں کے روز روز تشدد سے تنگ آچکا تھا، اسرائیلی علاقوں میں خودکش بم دھماکوں نے تباہی مچا رکھی تھی اس لئے اسرائیل نے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ ایک چھوٹے سے علاقے پر یاسر عرفات کو لا بٹھایا جائے تاکہ جن سرپھرے نوجوانوں کو وہ قابو میں رکھنے میں ناکام رہا ہے یہ کام خود یاسر عرفات کو سونپ دیا جائے۔ فلسطینی انتظامیہ کا قیام کسی واقعی امن کی جانب کوئی قدم نہیں تھا بلکہ اسرائیل کے لئے خود اپنی حفاظت کی طرف ایک قدم تھا۔ اس کے علاوہ فلسطینی انتظامیہ کے قیام سے اسرائیل کو ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اب تک جو لوگ فلسطین کی بازیابی کے لئے یکسوئی کے ساتھ مسلح جدوجہد کی راہ پر گامزن تھے وہ دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے معاہدہ امن کی حمایت کی تو دوسرا اسی مسلح تصادم کا حامی رہا۔ خود فلسطینیوں کے دو گروہ میں بٹ جانے سے ان کی قوت پارہ پارہ ہوگئی۔ اس طرح اسرائیل کے لئے تحفظ کا جو فوری مسئلہ پیدا ہو چلا تھا وہ کسی قدر ٹل گیا۔ اسرائیل نے کھلے الفاظ میں یہ بات کہی ہے کہ وہ فلسطینی انتظامیہ کو اسی حد تک برداشت کرے گا جب تک کہ ریاست اسرائیل کے تحفظ کو کوئی خطرہ نہ ہوا اور اسی لئے وہ فلسطینی علاقوں سے اپنے فوجی چوکیاں ہٹانے کے مسئلے پر ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ اسرائیل فلسطینی انتظامیہ سے بار بار یہ مطالبہ کرتا رہا ہے کہ وہ حماس کے تشدد پسندوں کو لگام دینے میں نرم رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ گذشتہ دنوں امن مذاکرات میں تعطل کے باعث اسرائیل اس بات پر بھی فکرمند ہے کہ مذاکرات کا یہ سلسلہ ختم نہ ہو جائے۔ اسرائیل کے ارادے بہت واضح ہیں۔ اولا وہ امن مذاکرات سے نکل کر فلسطینیوں سے راست ٹکر مول لینا نہیں چاہتا اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ واقعی اس خطے میں کوئی فلسطینی قوت وجود میں آئے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ایک فیصلہ کن معرکے سے مسلمانوں کو دور رکھا جائے اور امت کے باحوصلہ نوجوان خود مسلمانوں کے "پرامن" افراد سے الجھ کر اپنی قوتیں ضائع کرتے رہیں۔

جو لوگ موجودہ دنیا میں صرف گفت و شنید کے راستے انقلاب لانا چاہتے ہیں ان کے لئے فلسطین کے مسئلے میں بڑا سبق ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھی چاہئے کہ اسرائیل اگر کسی امن مذاکرات پر آمادہ ہوا ہے تو اس لئے نہیں کہ اچانک اسے امن پسندی کا ہیضہ ہوگیا ہے بلکہ حماس کے نوجوانوں نے اپنی پرتشدد کارروائیوں سے ایسی تباہی مچائی کہ اسے امن کی میز پر بیٹھنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ گویا آپ جسے گفت و شنید کی کامیابی کہتے ہیں وہ بھی دراصل مسلح جدوجہد کے ثمرات ہیں پھر اس حقیقت کو بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیجئے کہ دنیا میں کبھی بھی قیام امن کا نعرہ کمزوروں کا نعرہ نہیں ہوتا۔ یہ تو غاصبوں اور ظالموں کا نعرہ ہے جو اپنے ظلم و جبر کو برقرار رکھنے کے لئے اور اپنی حکومتوں کو بچانے کے لئے لگاتے ہیں اور جس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہماری موجودہ حیثیت کو تسلیم کرکے کچھ لے دے کر معاملہ کرلیا جائے۔ کمزوروں کا نعرہ تو ہمیشہ تصادم کا نعرہ ہوتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ غاصب گفت و شنید سے اس کی چیزیں واپس نہیں کرنے کا۔ اس کے لئے تو صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ وہ بزور بازو ظالموں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرے۔ زندہ قومیں امن کی بھیک نہیں مانگتیں بلکہ حقیقی اور منصفانہ امن کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہیں۔ □

مغرب کی ثقافتی یلغار سے اب اسلامی ایران میں خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بزدل اور کمزور شخص مقابلے کی تاب نہ لاکر فریق مخالف کو گالیاں دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے اسی طرح جو لوگ جابر حکمرانوں کو الٹ پھینکنے اور ان کا گریبان پکڑلینے کا حوصلہ نہیں رکھتے وہ اس عمل میں عافیت جانتے ہیں کہ اپنا غصہ ان حکمرانوں کے پتلے اور تصاویر پر اتار دیں۔ حکمراں بھی جانتے ہیں کہ مجسموں کو آگ لگانے سے ان کی ذات پر کوئی حرف نہیں آتا اور اس طرح کمزور دبے کچلے مخالفین کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ اسی طرح جو قومیں ثقافتی، معاشی، سیاسی اور جنگی محاذوں پر اپنے دشمنوں کے مقابلے کی اہل نہیں ہوتیں وہ کھیل کے میدان میں اپنے دشمن کو شکست دے کر خوش ہولیتی ہیں۔ فتح خواہ کھیل کے میدان میں حاصل کی جائے یا دشمن کا ایک بت بناکر اسے پھانسی پر لٹکاکر تسکین حاصل کی جائے۔ دونوں میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ ہم اپنے دشمن کو شکست تو ضرور دینا چاہتے ہیں لیکن عمل کے میدان میں اپنے کو کمزور پاکر اپنا غصہ ان چیزوں پر اتارتے ہیں جس میں ہار اور جیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان تمام ممالک میں جو زندگی کے تمام محاذ پر دنیا سے خاصے پیچھے ہیں اور جنہیں ہر لحہ ایک نئی شکست کا سامنا ہے۔ وہاں حکومتی اور عوامی ہر دو سطح پر کھیل کے میدان کو فتح کے جھوٹے احساس کو عام کرنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا کے شکست خوردہ ممالک حکومتی سطح پر کھیل کے میدان میں اپنی فتح کا جشن مناتے ہیں۔ دور کیوں جائیے پڑوسی ملک پاکستان کو لیجئے جو زندگی کے ہر محاذ پر اپنے پڑوسیوں کے مقابلے میں پس ماندہ ہے لیکن اس پس ماندگی کے نفسیاتی ازالے کے لئے کھیل کی فاتح ٹیموں کو قومی ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ شاید ایسا اس لئے کہ حکومت چاہتی ہے کہ اپنی ناکار کردگی اور شکست کو چھپانے کے لئے کھیل کے میدان میں فتح کا جھنڈا گاڑا جائے اور اسے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اتنا عام کیا جائے کہ عام لوگوں میں صورت حال کی تبدیلی کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کا داعیہ پیدا نہ ہو۔

دیکھا جائے تو مسلم دنیا کے بیشتر ممالک میں احساس محرومی اور ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے حکمرانوں نے کھیل کے میدان کو منتخب کیا ہوا ہے لہذا کہیں پوری قوم کرکٹ کے بخار میں مبتلا ہے تو کہیں لاکھوں کا مجمع فٹ بال میچ کی فتح کا جشن منارہا ہے۔ ان بیچاروں کو یہ خبر ہی نہیں کہ معرکے کا اصل میدان کہیں اور ہے اور یہ کہ موجودہ دنیا میں قوموں کے لئے عزت اور ذلت کے فیصلے کھیل کے میدان میں شکست یا فتح سے نہیں ہوتے۔

ایران جو گذشتہ بیس برسوں سے عام روش سے ہٹ کر انقلاب انقلاب کی صدا الاپتا رہا ہے اور جہاں قومی رہنماؤں نے مغرب کی ثقافتی یلغار کو روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ اسی راہ پر جانکلا ہے۔ 1979ء کے ایرانی انقلاب کے بعد گذشتہ بیس برسوں میں ایران کے اندر اگر کوئی انقلاب آیا ہے تو اسے فٹ بال انقلاب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ملک بھر میں کھیل کود اور تفریحی دلچسپیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت جان بوجھ کر ایک لبرل ماحول بنانے کے لئے کھیل کی ترویج و اشاعت میں حصہ لے رہی ہے۔ ایرانی گذشتہ بیس برسوں سے خود کو دنیا سے الگ محسوس کررہے تھے اب جو کھیل کے میدان میں انہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا ہے اور بیرون ممالک میں ایرانی کھلاڑیوں کے آنے جانے کا ماحول پیدا ہوا ہے تو اس جلو میں اجنبی ثقافت نے ایران کی سرزمین پر پھر سے اپنے پنجے گاڑنے شروع کردیے ہیں۔ اب فٹ بال کی فتح کے جشن میں ایران کی سڑکوں پر ہاؤ ہو کا جو ہنگامہ دیکھنے میں آتا ہے اور جس طرح نئی نسل رقص و سرود کے ہنگامے میں کھوجاتی ہے۔ جوش و فتح میں لڑکیاں اپنے دوپٹے پھینک دیتی ہیں اور اس پورے تماشے پر مذہبی انتظامیہ خود کو بے بس محسوس کرتی ہے تو ان باتوں سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا

ان بیچاروں کو یہ خبر ہی نہیں کہ معرکے کا اصل میدان کہیں اور ہے اور یہ کہ موجودہ دنیا میں قوموں کے لئے عزت اور ذلت کے فیصلے کھیل کے میدان میں شکست یا فتح سے نہیں ہوتے۔

ملک میں ایسے لوگوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوگیا ہے جو اب امریکہ کو شیطان عظیم تصور نہیں کرتے اور جن کا کہنا ہے کہ ایران مغرب سے الگ رہ کر اپنے حالات درست نہیں کر سکتا۔

ہے کہ ایران میں اب جو لوگ اقتدار پر فائز ہیں وہ ایرانی معاشرے کو خمینی کے راستے سے ہٹاکر مغرب کے راستے پر لے چلنے کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ گذشتہ اگست میں جب سے ایران میں موجودہ صدر خاتمی برسراقتدار آئے ہیں۔ سرکاری سطح پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ ایران کو دوبارہ مغرب کے لئے قابل قبول بنایا جائے اور ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایرانی قوم اپنے سخت مغرب مخالف موقف سے دست بردار ہوکر امریکہ کے حاشیہ نشینوں میں شامل ہوجائے۔ دیکھا جائے تو صدر خاتمی نے گذشتہ آٹھ نو ماہ میں ایران کو مغرب کے لئے قابل قبول بنانے میں خاصہ کام کرلیا ہے۔ اولا ملک میں ایسے لوگوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوگیا ہے جو اب امریکہ کو شیطان عظیم تصور نہیں کرتے اور جن کا کہنا ہے کہ ایران مغرب سے الگ رہ کر اپنے حالات درست نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ایران میں ایسے تجدد پرستوں کا دباؤ بڑھتا جارہا ہے جو معیشت کی اصلاح کے لیے مغرب سے سمجھوتے کے حق میں ہیں۔ دوسری طرف امریکہ نے بھی اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ وہ ایران سے مذاکرات کا خواہاں ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ایران اپنی سخت گیر پالیسی کو ترک کردے۔ امریکہ نے ایران سے تین باتوں کی ضمانت چاہی ہے۔ اولا وہ خطرناک اسلحوں کی تیاری بند کردے۔ ثانیا بین الاقوامی سطح پر مسلم انقلابیوں کی مدد بند کرے اور عرب اسرائیل امن مذاکرات کو کھلے دل سے تسلیم کرلے لیکن ایران کی حکومت پہلی دو باتوں سے سرے سے انکار کرتی ہے۔ اس کا دعوی ہے کہ نہ تو وہ اسلحوں کی دوڑ میں شامل ہے اور نہ ہی تشدد پسند مسلمانوں کی مدد کرتی ہے۔ رہی یہ بات کہ مسئلہ فلسطین پر ایران اپنے موقف سے دست بردار ہوجائے تو یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے لیے کم ازکم فی الوقت ایرانی حکومت آمادہ نہیں ہوگی۔

امریکہ چاہتا ہے کہ وہ ایران کو مذاکرات کے ٹیبل پر لا بٹھائے لیکن ایران کی مشکل یہ ہے کہ بیس سال تک امریکہ کو شیطان بزرگ قرار دینے والی قوم کو اچانک یہ باور کرانا مشکل ہے کہ وہ شیطان اب ہم سے دوستی کے لیے مخلص ہوگیا ہے البتہ دونوں طرف ثقافتی تبادلے کے نام پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی ہے۔ امریکہ نے پچھلے دنوں ایرانیوں کے لئے ویزے کی سہولتیں آسان کردی ہیں اور ایران نے بعض امریکی عہدیداروں کا سرکاری مہمان کی حیثیت سے استقبال بھی کیا ہے۔ اس بات کا بھی اشارہ ملا ہے کہ شاید جلد ہی تہران میں سوئزرلینڈ کے سفارت خانے میں جلد ہی ایک امریکی نمائندے کو کام کرنے کا موقع مل جائے گویا اٹھارہ سال بعد ایرانی دوبارہ شیطان بزرگ کے سفارت خانوں کو اپنی زمین پر بلانا چاہتے ہیں۔

البتہ ایران کی نئی قیادت کے لئے پوری قوم کو امریکہ کا دوست بنادینا اتنا آسان نہیں ہوگا اس لئے کہ آیت اللہ خمینی کے حامیوں کا ایک بڑا طبقہ آج بھی امریکہ اسلام اور مسلمانوں کا اولین دشمن سمجھتا ہے۔ گذشتہ دنوں پیرس میں ایرانی حکومت کے نمائندے نے جب اس تاثر کا اظہار کیا کہ جب سے امریکی پالیسیوں میں مثبت تبدیلی کا اشارہ ملا ہے تو امریکہ مخالف حلقوں نے اس پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ کون سی مثبت تبدیلی ہے جس کی طرف ایرانی حکومت اشارہ کرتی ہے۔ کیا اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ امریکہ آج بھی خلیج فارس میں ہم پر دانت گڑائے ہوئے ہے؟ وہ اسلامی تحریکوں سے ہماری دوستی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور تجارتی پابندیوں کے ذریعے ہماری کمر توڑ دینا چاہتا ہے۔ معاملہ اس حد تک آگے بڑھا کہ ایرانی حکومت کو یہ صفائی دینا پڑی کہ وہ امریکیوں کو تہران میں کوئی دفتر کھولنے کی اجازت دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

اس وقت ایران میں تجدد پسندوں اور حامیان انقلاب کے درمیان کشمکش عروج پر ہے۔ تجدد پسندوں کی نمائندگی صدر خاتمی کر رہے ہیں تو دوسری طرف ایران کے روحانی قائد آیت اللہ خامنی کی قیادت میں حامیان انقلاب نے اپنی قوت کو مجتمع کر رکھا ہے۔ خامنی کے حامیوں کو یقینا زیادہ اختیارات حاصل ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ صدر خاتمی ستر فیصد رائے دہندگان کے ووٹوں سے برسراقتدار آئے ہیں اس لئے خاتمی کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں ایران کی سمت متعین کرنے کا پورا پورا حق ہونا چاہئے۔ البتہ خامنی نے یہ کہہ کر حکومت کے لئے مشکل میں اضافہ کردیا ہے کہ وہ امریکہ سے تعلقات کی بہتری کے حق میں نہیں ہے۔ خامنی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اگر ایران امریکہ سے گفت و شنید کا دروازہ کھولتا ہے تو اسے امریکہ کی بہت سی شرائط کو ماننا ہوگا خاص طور پر امریکہ یہ چاہے گا کہ انقلابی تحریکوں کو ایران جو تھوڑی بہت مدد دیتا رہا ہے اسے فوری طور پر بند کردیا جائے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس بات کا امکان ہے کہ امریکہ فلسطین کے مسئلے پر ایران پر دباؤ ڈالے اور امن مذاکرات کے نتائج کو

تسلیم کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔ پچھلے دنوں آیت اللہ خامنی نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ ایران کسی بھی قیمت پر اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا اور اپنے اس ارادے کو بھی چھپانا نہیں چاہے گا کہ وہ ہر قیمت پر اسرائیل کی تباہی چاہتا ہے حتی کہ ہم امریکہ کو بھی اس وقت تک اپنا دشمن سمجھتے رہیں گے جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پالیسیوں سے باز نہ آجائے۔

مشکل یہ ہے کہ ایران کی اقتصادی صورت حال سے بہت لوگ تنگ آچکے ہیں۔انہیں تجدد پسندوں کے اس وعدے میں امید نظر آتی ہے کہ امریکہ سے تعلقات کی بحالی کے نتیجے میں ہمارے معاشی حالات اچھے ہوجائیں گے اور شاید ایران کو امریکی بینکوں میں پھنسا ہوا وہ سرمایہ بھی دوبارہ مل جائے گا جو انقلاب کے بعد امریکہ نے منجمد کردیا تھا لیکن حامیان انقلاب کا کہنا ہے کہ اگر ہم اپنی بنیادی دعوت سے منحرف ہوگئے تو پھر ایران میں رہ ہی کیا جائے گا؟ دریں اثناء امریکی پالیسی سازوں پر بھی یہ دباؤ بڑھ رہا ہے کہ وہ ایران کو مغرب سے قریب لانے کے لئے ہر ممکنہ تعاون دے تاکہ تجدد پسندوں کی مشکلیں آسان ہوں اور جس ایران کو بزور بازو زیر کرنا ممکن نہ ہوسکا تھا اسے افہام و تفہیم کے ذریعے زیر کیا جاسکے۔

نظام کفر چاہتا ہے کہ مسلمان صرف تسبیح و تذکیر میں لگے رہیں

کفر کی عالمی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہوئی ایک تحریر

تحریر: غطریف شہباز ندوی

بیسوی صدی کے اواخر کا ایک ناقابل انکار واقعہ پوری دنیا میں اسلامی بیداری کی لہر میں زبردست اضافہ ہے۔ جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کمیونزم کے زوال کے بعد اسلام کے آنے کا خطرہ مغرب کے دل و دماغ پر پوری طرح مسلط ہوگیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس اسلامی بیداری کو کچلنے اور اسلام کی پیش رفت کو ہر قیمت پر روکنے کے لیے اسلام کے خلاف مغربی اور عالمی سازشوں میں بھی تندی اور تیزی آگئی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صدیوں سے جاری یہ سازشیں انتہائی متنوع اور مختلف ہیں۔ عقائدی۔ فکری۔ تہذیبی۔ سیاسی۔ معاشی اور معاشرتی ہر محاذ پر آج دشمن اسلام پر حملہ آور ہے۔ سطور ذیل میں دشمنان اسلام کے بعض طریقہائے کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مغرب کو جس چیز کا خوف سب سے زیادہ ستاتا ہے وہ قرآن ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ آخری ربانی کتاب ہونے کی وجہ سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ آخری صحیفہ ہدایت ہونے کی حیثیت سے انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کردیتا ہے بلکہ اپنے پیش کردہ نظام زندگی کو دنیا میں غالب و نافذ کرنے کی جدوجہد میں اسے لاکھڑا کرتا ہے اور اپنے حاملین کے دلوں میں جذبہ حب رسول و جذبہ شہادت پیدا کرنے اور انھیں اپنے انقلابی رول کو ادا کرنے پر آمادہ کرنے اور ابھارنے کا اصل سرچشمہ بھی وہی ہے۔ اس بات کو دشمن بالخصوص مغرب اچھی طرح سمجھتا ہے اور اسی لیے اپنے تمام تر لبرل دعووں اور مذہبی غیر جانبداری کے پروپیگنڈے کے باوجود وہ کبھی بھی قرآن کے خلاف اپنے جذبات چھپا نہیں پاتا۔ اس کے پروردہ مستشرقین اپنی نام نہاد علمی و تحقیقی کاوشوں کے ذریعہ قرآن کو انسانی کلام قرار دینے کی کوشش کرتے ہی رہے ہیں۔ سیاسی اور عوامی سطح پر بھی اکثر اوقات میں اسی کتاب سے مغرب کا عناد اور غم و غصہ سینوں کے باہر آجاتا ہے۔ چنانچہ شرق اوسط میں برطانوی استعمار کا اہم ترین معمار گلیڈ چلا اٹھتا ہے کہ "جب تک یہ قرآن موجود ہے۔ یوروپ کو مشرق اوسط پر غلبہ و اقتدار حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہی نہیں بلکہ خود یوروپ خطرہ کے دہانہ پر رہے گا۔" (فکری یلغار صفحہ 21) مشنری سرگرمیوں کا ایک اہم ستون لارنس براون کہتا ہے کہ "صحیح معنوں میں بڑا خطرہ اگر کوئی ہے تو وہ (قرآن کی شکل میں) اسلامی نظام میں پوشیدہ ہے کیونکہ اس میں پھیلنے اور

خود مسلمان کے پڑھے لکھے طبقات میں بطور خاص جنھوں نے مغرب میں جدید تعلیم پائی ہے اس رجحان کو بڑھاوا دیا جارہا ہے کہ وہ عام انسانوں ہی کی طرح رسول کی ذات کو بھی آزادانہ تنقید و تحقیق کا موضوع بنائیں

اپنی بات منوانے کی بڑی زندگی اور صلاحیت ہے جو مغربی استعمار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔"(صفحہ21)

عالم اسلام پر دشمنی کی نظریاتی یلغار کی ایک وجہ اس اساس پر قائم ہے کہ مسلمانوں کی نظروں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی اہمیت کو ساقط کرنے کی کوشش کی جائے، ان کے دلوں سے حب رسول کے جذبات نکال دیے جائیں چنانچہ اس سلسلہ میں برصغیر کے اندر آریہ سماج نے نصف صدی پہلے "رنگیلا رسول" اور "محمد بیویوں والا" جیسی فتنہ انگیز اور شرارت بھری ناپاک کتابوں کی اشاعت کی تھی، یہ تسلسل مختلف پیمانوں پر دنیا بھر میں اور خود عالم عرب میں بھی قائم ہے یہی وجہ ہے کہ سلمان رشدی سے لے کر تسلیمہ نسرین تک ایسے تمام عناصر کو ابھارنے اور تشہیر کرنے کی منظم کوشش کی گئی جنھوں نے رسول اکرم کی ذات پر سوقیانہ حملے کیے ہیں، ان کو سر پر بٹھایا گیا، عوامی غم و غصہ سے بچانے کے لیے مغربی ممالک نے اپنے دروازے ان پر کھول دیے، ان کی حفاظت کے لیے سکیورٹی کے انتظامات کردیے گئے اور ان کو ہر طرح سے نوازنے کی کوشش کی گئی، ان کی کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے اشاعت کی گئی، خود مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقات میں بطور خاص جنھوں نے مغرب میں جدید تعلیم پائی ہے اس رجحان کو بڑھاوا دیا جارہا ہے کہ وہ عام انسانوں ہی کی طرح رسول کی ذات کو بھی آزادانہ تنقید و تحقیق کا موضوع بنائیں۔

اسی طرح جذبہ جہاد و شہادت کو ختم کرنے کی غرض سے اسے دہشت گردی، بنیاد پرستی اور مذہبی تشدد جیسے عنوانات سے موسوم کرکے پوری فضا اس کے خلاف بنادی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے اسلام کو ایک بے رحم اور خوں خوار مذہب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اسلام اور تلوار کے افسانے کو خوب خوب بڑھاوا دیا گیا اور اب اس کے لیے دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کو جس ظلم وجبر کا سامنا ہے، جن اندوہ ناک حالات سے وہ گزر رہے ہیں اس کے رد عمل میں اپنے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اور اپنی دینی شناخت کے وجود و بقا کی جدوجہد کرنے والے مجاہدین کی جہادی سرگرمیوں کو دلیل بنایا جارہا ہے۔ اس کے اسباب و وجوہات اور مبررات سے بالکل آنکھیں موندلی گئی ہیں۔ فلسطینی مجاہد رمزی یوسف کو امریکی سی آئی اے پاکستان سے پکڑ کرلے جاتی ہے، کہیں سے اف کی بھی کوئی آواز نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری امت جرم ضعیفی کی سزا میں اس طرح کی ذلت کی زندگی جینے کے لیے مجبور کردی گئی ہے۔ اس پورے تماشے کا اصل مقصد مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی فریضہ جہاد سے غافل کرنا ہے اور مخالفین اپنی مہم میں اس قدر کامیاب ہیں کہ اب مسلمانوں کی اکثریت اس لفظ کے استعمال سے بھی گریز کرتی ہے یہاں تک کہ بہتیرے داعیان، دینی و ملی جماعتیں اور غلبہ اسلام کا منشور رکھنے کا دعوی کرنے والی تحریکیں بھی جہاد کے لفظ کو بولتے وقت یہ وضاحت ضروری سمجھتی ہیں کہ جہاد اسلام میں صرف دفاع کے لیے ہے۔

دشمن کا ایک تاریخی طریقہ کار مسلمانوں کے ایسے بے محابا قتل عام کی شکل میں اپنایا جاتا رہا ہے جس سے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہوکر رہ جائیں چنانچہ کل ہی کی بات ہے کہ مسیحی مغرب نے بوسنیا میں مسلمانوں کی نسلی تطہیر کی ایسی وحشت انگیز مہم چھیڑی تھی جس سے چنگیز و ہلاکو کی روحیں بھی شرماگئی ہوں گی۔ بوسنیا کے بعد چیچنیا میں قیامت توڑ دی گئی اور یہی کہانیاں آج دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی دہرائی جارہی ہیں۔ یہ آج ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جبر و تشدد کا یہ تجربہ تاریخ میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ہمیں ملتا ہے کہ کم از کم دو ایسے جان لیوا خطروں کا اسلام نے سامنا کیا ہے جن سے یہ اندیشہ ہوگیا تھا کہ اسلام دنیا سے ختم ہوجائے گا۔ 1۔ عالم اسلام پر صلیبی حملہ، جو گیارہویں صدی عیسوی میں پیش آیا جس کے نتیجہ میں یوروپ کی متحدہ صلیبی طاقتوں نے شام، فلسطین و بیت المقدس پر قبضہ کرلیا تھا اور عین مسجد اقصی کے احاطہ میں چشم فلک نے مسلمانوں کے خون کی ارزانی دیکھی تھی لیکن ایمانی قوت اور جذبہ جہاد و شہادت کی بدولت ہم اس خوں آشام یلغار سے بھی جانبر ہوگئے۔ صلاح الدین ایوبی کی صورت میں امت کی قوت مدافعت بیدار ہوگئی اور ایک بار پھر بیت المقدس پر توحید کا علم لہرادیا گیا۔
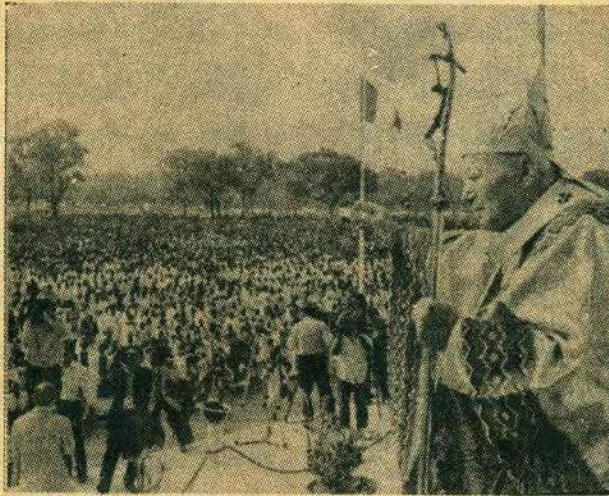
دوسرا تاتاری حملہ تھا جو پندرہویں صدی عیسوی میں پیش آیا تھا۔ یہ عالم اسلام پر ایک ایسی قیامت تھی کہ جس کی المناک روداد تحریر کرتے وقت مورخین کا

قلم بھی کانپتا ہے حتیٰ کہ شیخ سعدی جیسے صوفی نے بغداد کے ماتم میں خون کے آنسو بہائے ہیں۔ غیر متمدن اور صحرائی تاتاریوں کا یہ حملہ اتنا بے پناہ اور اتنا شدید تھا کہ کہیں مسلمان مقتولین کے خون سے دجلہ کا پانی سرخ سرخ ہوجاتا اور کہیں ان کے کٹے ہوئے سروں سے وحشی فاتحین سربفلک مینار تعمیر کرکے اپنی فتح کا جشن منایا کرتے تھے۔ پوری دنیا میں یہ بات ایک مسلمہ اور مثل کی حیثیت اختیار کرگئی کہ تاتاریوں کو شکست نہیں دی جاسکتی، لیکن ہم اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے اور آگ و خون کے اس مہیب طوفان سے بھی سرخ رو ہوکر نکلے آئے۔ آج ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ مغرب، اس کی تہذیب اور اس کی ترقیوں سے مرعوب ہے، احساس کمتری میں بتلا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ امت کے مستقبل سے مایوس نظر آتا ہے۔

موجودہ دور میں ایک اور اہم ہتھیار جسے دشمن نے عالمی پیمانے پر اختیار کیا ہوا ہے اور آج کے ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ نے جس کی شدت کو دوچند کردیا ہے، وہ پروپیگنڈے کی طاقت ہے۔ مغرب بطور خاص اس کا بے پناہ استعمال کررہا ہے، مراکشی ڈاکٹر حمید قلاب اور لبنان کے اسکالر محمد اقبال نے مشترکہ طور پر 1960 سے 1965ء تک امریکہ میں اسلام پر شائع ہونے والی تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور اپنی تحقیق کے نتائج مرتب شکل میں شائع کردیے ہیں۔ ان کی تحقیقات کے مطابق اس مختصر سی مدت میں امریکہ میں اسلام کے خلاف 25 کتابیں 30 ہزار رسالے شائع ہوئے، 60 ہزار مضامین چھاپے گئے، 25 ہزار فلمیں بنائی گئیں۔ فرانس اور سویڈن میں 15 ہزار کتابیں چھپیں، 12 ہزار رسائل شائع کیے گئے، 50 ہزار مضامین چھاپے گئے۔ 3 ہزار فلمیں تیار ہوئیں۔ (السلام سہ ماہی نئی دہلی) اسلام کے خلاف عالمی نشریاتی تحریک کا یہ حال ہے۔ یہ چند ملکوں کی بات ہے اگر پوری دنیا کا اسی حیثیت سے جائزہ لیا جائے تو یہ فہرست کئی گنا ہوسکتی ہے۔

اس دور کو روشنی اور علمی ترقیات کا دور کہا جاتا ہے، جس سے پیدا شدہ امکانات کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی استعمار نے نیز دنیا کے مختلف علاقوں میں اس کے حلیفوں اور آلہ کاروں نے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لانے کے نام پر انھیں سیکولرائز کرنے کی بھرپور کوشش کی اور ایک طرف تو یورپ و امریکہ میں اسلامی علوم و فنون پر ریسرچ و تحقیق کے بڑے بڑے ادارے کھول دئے اور جدید ترین اعلیٰ طرز کی تعلیم گاہوں میں اسلامی علوم، فقہ و حدیث، تاریخ و تفسیر، عربی زبان و

دوسری طرف ایسا سیکولر نظام تعلیم مسلم ملکوں میں رائج کیا گیا جسے پڑھ کر مسلمانوں کی نئی نسلیں نام کی تو مسلمان رہ جائیں باقی اپنی اپنی شناخت، ثقافت اور روایات سے خود بخود دست بردار ہوجائیں

مسلمانوں کی اکثریت یہاں تک کہ بہتیرے داعیان، دینی و ملی جماعتیں اور غلبہ اسلام کا منشور رکھنے کا دعویٰ کرنے والی تحریکیں بھی جہاد کے لفظ کو بولتے وقت یہ وضاحت ضروری سمجھتی ہیں کہ جہاد اسلام میں صرف دفاع کے لیے ہے۔

ادب وغیرہ کے ماہرین کی کھیپیں کی کھیپیں تیار کردیں، جنھوں نے اپنی زبردست کوششوں سے ان علوم پر تحقیقات کیں اور خود مسلمانوں کو ان کے اندر اپنا دست نگر بنادیا۔ دوسری طرف ایسا سیکولر نظام تعلیم مسلمان ملکوں میں رائج کیا گیا جسے پڑھ کر مسلمانوں کی نئی نسلیں نام کی تو مسلمان رہ جائیں باقی اپنی اپنی شناخت، ثقافت اور روایات سے خود بخود دست بردار ہوجائیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں غلط تصور دین پوری طرح جڑ پکڑ گیا ہے۔ کبھی انھیں سیکولرزم کا سبق پڑھایا گیا، کبھی جمہوریت کی لوری دی گئی، غربت و جہالت کے مارے مسلم علاقوں میں عیسائی مشنری ادارے مفت تعلیم، خدمت خلق اور رفاہی کاموں کے ذریعہ مسلمانوں کو مرتد بنانے میں خاصے کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ برصغیر میں مشن اسکولوں نے بطور خاص جن میں خود عیسائی بچے 20 فیصد ہوتے ہیں اور 75 فیصد مسلم بچے ہوتے ہیں، 15 فیصد دوسرے مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی مہم میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ہندو احیاء پرستوں کے ذریعہ چلائے جارہے ہزارہا اسکولوں کے ذریعہ نئی مسلم نسل کے معصوم ذہنوں کو اسلامی تعلیمات کے بارے میں مسموم کردیا گیا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آج مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو ہرچند کہ نماز روزہ کرتا ہے لیکن اسلام کی تعلیمات کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا ہے اور دلی طور پر اسلام سے خارج ہوتا جارہا ہے۔ مغرب کے پروردہ خود مسلم اسکالرز کے ذریعہ اسلامی امتیازات مثلاً نکاح و طلاق اور تعدد ازدواج کو بھی نشانہ بنایا جارہا ہے۔ آج خود مسلم نوجوان ان احکامات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ میں ظاہر شریعت اور روح شریعت کے شاخسانے گڑھے۔ دشمنوں کی انھیں کوششوں، ہتھکنڈوں اور مختلف و متنوع سازشوں کو علامہ اقبال ابلیس کی زبان سے یوں تعبیر کرتے ہیں۔

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپادے اس کی نظروں سے تقاضائے حیات

مسلم سیاسی پارٹی کی حمایت اور نصرت کے لئے

دردمندانِ امت کے نام قائد ملی کا ایک اہم مکتوب

برادران اسلام اور دختران ملت

اسلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ

یہ بات یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ملی پارلیامنٹ اپنے قیام کی ابتداء سے ہی ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی صف بندی کے لئے کوشاں رہی ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں کے سیاسی تجربے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس ملک میں اگر مسلمانوں کو اپنی ملی اسلامی زندگی عزیز ہے تو انہیں ہر صورت میں اپنی شیرازہ بندی کا کام انجام دینا ہوگا اور ہم کسی ایسی شیرازہ بندی کو مکمل نہیں سمجھتے جس میں سیاسی زندگی کو ملی زندگی سے یکسر علیحدہ کردیا گیا ہو۔ ہمیں اس صورت حال پر شدید تشویش ہے کہ آج امت مختلف غیر مسلم سیاسی آقاؤں کی اتباع میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ہم اس صورت حال کو فکری اور عملی ارتداد سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے ہر صورت میں بدل ڈالنا اپنا مذہبی فریضہ جانتے ہیں۔

اس حقیقت سے تو شاید اب کسی کو اختلاف نہ ہو کہ اس ملک کی موجودہ تمام سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے لئے مخلص نہیں ہیں۔ ان میں نہ کوئی سیکولر ہے اور نہ کوئی فرقہ پرست، یہ سب دراصل غلیظ کفر کی مختلف شکلیں ہیں جن سے دامن بچانے میں ہی ہمارے ملی وجود کی سلامتی ہے۔ آپ یقینا اس بات سے بھی انکار نہیں کریں گے کہ فی زمانہ پچیس کروڑ ہندوستانی مسلمان سیاسی زندگی میں ایک خوفناک خلاء محسوس کرتے ہیں۔ انہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ جانا کدھر ہے؟ اور یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت سیاسی محاذ پر ان سے کس عمل کا مطالبہ کرتی ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ پوری امت پر کفار و مشرکین کے مختلف گروہوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں باشعور لوگ کھلے عام مختلف غیر اسلامی ایجنڈوں کے لئے کام کر رہے ہیں۔ کوئی اس ملک پر گاندھی کا خواب مسلط کرنا چاہتا ہے تو کسی کو اصرار ہے کہ امبیڈکر کا سماجی انصاف اس ملک میں طلوع ہو۔ کوئی ہندو احیاء پرستوں کے خاکے میں رنگ بھرنے میں مصروف ہے تو کسی کو کمیونسٹوں کے عزائم کی تکمیل پر اصرار ہے۔ یہ کتنی بڑی بد قسمتی ہے کہ آج اس ملک میں آخری رسول کی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایجنڈے کو چھوڑ کر علی الاعلان باطل ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں اپنی قوت صرف کر رہی ہے۔ اسی پر بس نہیں بعض چوٹی کے اہل علم اور حاملین شریعت بھی سیکولر جمہوری قدروں کی بحالی کے لئے خم ٹھوک کر میدان میں آگئے ہیں۔ البتہ کسی کو اس بات کی کم ہی فکر ہے کہ سابق دار الاسلام ہندوستان کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کے لئے کیا کچھ کرنا چاہئے۔

اللہ کا خاص فضل ہے کہ اس نے مٹھی بھر لوگوں کو یہ توفیق دی کہ وہ ملی پارلیامنٹ کے مختلف اجلاس میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی غلامی کے سدباب کی فکر کریں۔ پٹنہ کے سیاسی اجلاس میں (منعقدہ جنوری 1996ء) مسلم سیاسی بل کی منظوری کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو بجاطور پر یہ امید بندھی تھی کہ ہم سیاسی محاذ پر مزید رہنمائی کے لئے آگے آئیں گے۔ مارچ 1997ء کے مذہبی اجلاس (منعقدہ ہبلی کرناٹک) میں یہ بات اصولی طور پر طے کردی گئی کہ ہندوستانی مسلمان اپنی سیاسی صف بندی کے لئے ایک علیحدہ ملک گیر سیاسی پارٹی وجود میں لے آئیں۔ اس فیصلے کے بعد مختلف سطح پر مسلم سیاسی پارٹی کے خدوخال پر بحث و مباحثہ شروع ہوگیا۔ اخبارات کے کالم میں اس کی حمایت و مخالفت میں مضامین شائع ہونے لگے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے کسی فیصلے نے نظام کفر کو اتنا پریشان نہ کیا ہوگا جتنا اس دور رس سیاسی فیصلے نے انہیں خوفزدہ کردیا۔ خاص طور پر وہ سیاسی پارٹیاں جو مسلم مسیحائی کا دعوی کرتی ہیں اور جو مسلم ووٹوں پر ایوان میں پہنچتی ہیں انہیں اس فیصلے میں اپنی موت نظر آئی لہذا ایک منصوبہ بند کوشش کے تحت انگریزی اخبارات میں ملی پارلیامنٹ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا۔ مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ یہ خطرناک لوگ ہیں، ان کے عزائم غیر جمہوری اور غیر دستوری ہیں۔ خاص طور پر حالیہ لوک سبھا انتخابات کے موقع پر حامیان ملی پارلیامنٹ کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی لیکن تب بھی اللہ کے فضل سے ہم کسی لالچ یا دباؤ میں نہیں آئے اور دہلی کے خصوصی اجلاس (منعقدہ فروری 1998) میں امت کے نام جو پیغام جاری کیا گیا اس میں بصراحت یہ بات کہی گئی کہ شریعت کی رو سے مسلمانوں کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ کفار و مشرکین کی سیاسی بالادستی کے لئے اپنے ووٹ کا استعمال کریں۔ ہم نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ جب تک مسلمانوں کی ایک علیحدہ مسلم سیاسی پارٹی وجود میں نہیں آتی اور جب تک ایک اسلامی متبادل سامنے نہیں آتا وہ اپنے ووٹ محفوظ رکھیں اس لئے کہ ووٹ ایک امانت ہے اور شرعی طور پر ہمارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ ہم اس امانت کو کسی غیر اسلامی نظام کے استحکام کے لئے استعمال کریں۔

دہلی کے خصوصی اجلاس میں مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کے لئے جو لائحہ عمل ترتیب دیا گیا تھا اللہ کے فضل سے اب وہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔ اس سے پہلے کہ ایک ملک گیر سیاسی پارٹی کا باقاعدہ اعلان کیا جائے، ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ امت کے دردمند حضرات سے مشورے اور تعاون کی درخواست کریں۔ آپ کی خدمت میں یہ عریضہ ہم اسی مقصد کے تحت ارسال کر رہے ہیں۔ توقع ہے ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ سیاسی بے سمتی کے ازالے میں آپ ہمیں بھرپور تعاون سے نوازیں گے۔ البتہ اگر ہماری معروضات مزید تفصیل چاہتی ہوں یا آپ کو کسی خاص نکتہ کی وضاحت مطلوب ہو تو ہم سے رابطہ کرنے میں نہ ہچکچائیں۔ انشاء اللہ تعاون کے حصول میں آپ ہمیں مستعد اور مخلص پائیں گے۔

والسلام

آپ کا بھائی

راشد شاذ

ملیشیا میں ہندو مسلم تصادم سر ابھار رہا ہے

پینانگ سے معروف صحافی چن سے ای کی ایک تازہ رپورٹ

گذشتہ جنوری میں ملیشیائی شہر جارج ٹاؤن میں جب ایک مختصر سے ہندو مندر میں دن میں تین وقت گھنٹے بجنے لگے تو اس کا نتیجہ بڑا سنگین نکلا۔

قریب کی ایک مسجد میں موجود مسلمانوں کو یہ شکایت ہوئی کہ مندر کے گھنٹوں کی آواز بہت تیز تھی اور مارچ کے اواخر میں دونوں کے درمیان اختلاف اس حد تک بڑھا کہ سیکڑوں ہندو اور مسلمان پنیانگ کی عموماً پُرسکون سڑکوں پر لوٹ مار کرتے ہوئے نکل آئے۔ اس میں چار افراد زخمی ہوئے اور تقریباً دو سو فسادیوں کو گرفتار کیا گیا۔

اگرچہ فسادات نسبتاً ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود تھے اور ان پر جلد قابو پالیا گیا لیکن ان پر رد عمل آج بھی 13 مئی 1996ء کو ملیشیا میں پھوٹ پڑنے والے نسلی فسادات کی واضح طور پر یاد دلاتا ہے۔ یہ واقعہ حکومت کی اس تشویش کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اقتصادی مشکلات کے اس دور میں بے اطمینانی پنیانگ جیسے علاقے میں بھی پھیلے گی جو اعلیٰ ٹیکنولوجی کی اشیاء تیار کرنے والی کمپنیوں کا گڑھ ہے اور ایک ایسی ریاست ہے جو پورے ملیشیا میں اقتصادی ترقی کا روشن ترین ثبوت فراہم کرتا رہا ہے۔

ملیشیا میں نسلی تقسیم	
ملائی مسلمان	57.7%
چینی	25.6%
ہندوستانی	10%
غیر شہری باشندے	6.3%

فسادات میں نقصانات کی تلافی پر مامور سرکاری مشینری فوراً حرکت میں آئی۔ پولس نے بارہ سو افسر مختلف جگہوں پر متعین کردے۔ اخبارات نے فسادات کو ہوا دینے کے بجائے میل ملاپ کے جذبات کو فروغ دینے پر زیادہ توجہ دی۔ نائب وزیر اعظم اپنی بہت سی مصروفیات چھوڑ کر ایک علامتی Makeup and Kiss فوٹو کی تقریب کی صدارت کرنے پہنچے اور یہاں تک کہ فیکٹری کے مالکان اور اعلیٰ عہدیداران نے اپنے ملازمین اور کاریگروں کو مذہبی ہم آہنگی کے فراخدلانہ مظاہرے سے اپنی فیکٹریوں میں امن و امان کا یقین دلایا۔

جس مندر میں گھنٹہ بجایا جارہا تھا اسی کے نسلی ہندوستانی قانونی مشیر داتوک کے وجے نارائن کا خیال ہے کہ ہر شخص کے ذہن میں 13 مئی 1996ء کے واقعات گھوم رہے تھے۔ اس فساد میں ملائی اور چینی باشندوں کے درمیان تصادم ہوا تھا۔ ملیشیا کی تاریخ میں اس تاریک دور نے ملیشیا کے لیے مؤثر عملی پالیسیوں کو جنم دیا جو آج بھی برابر ملیشیائی معاشرے کی تشکیل میں کارفرما ہیں۔ چھوٹا بڑا ہر فرد خود سے یہی سوال کررہا تھا کہ اگر لوٹ مار کا یہ سلسلہ طول پکڑ گیا تو کیا ہوگا؟

لیکن فساد رک گیا۔ جھگڑے کے دو ہفتے بعد ریاستی راجدھانی جارج ٹاؤن میں زندگی کی ہماہمی پھر لوٹ آئی اور اس کے قریب ہی واقع انٹل کارپوریشن اور ہیولٹ پیکارڈ کمپنی کی ہائی ٹیک فیکٹریاں پہلے کی طرح پھر کام میں مصروف ہوگئیں۔ پنیانگ کے وزیر اعلیٰ تان کو سوکون نے جو خود بھی نسلاً چینی ہیں اس فساد کے لیے مشتعل نوجوانوں کے مختصر گروہ کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہونے والے بھرپور فرقہ وارانہ تصادم سے تعبیر نہیں کرتے تاہم وزیر موصوف نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس واقعے سے ظاہر ہے کہ اگر ہم پوری طرح چوکس نہیں رہیں گے تو مذہبی اور نسلی مسائل کھڑے ہوسکتے ہیں۔

یہ ایک اور بد خبری ہوگی جس کی ملیشیا کو ضرورت نہیں ہے۔ ملیشیا ایک مدت سے ایک مستحکم حکومت اور ملائی اکثریت، نسلی چینیوں اور ہندوستانی باشندوں کے درمیان نسلی ہم آہنگی پر خاص توجہ دیتا رہا ہے کیونکہ بیرونی سرمایہ کاروں کے لیے وہ بڑی کشش کا باعث ہیں جیسے جیسے سرمایہ کاری کے لیے علاقائی اقتصادی بحران تیز ہوتا جارہا ہے یہ بات اور زیادہ اہمیت اختیار کرگئی ہے۔

تان سری کدہ جیسے لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ صنعت کاری اور شہری توسیع کے عمل نے نسلی گروہوں اور مذاہب کو باہم اس طرح مخلوط کردیا ہے۔ ان کے درمیان امتیاز ختم ہوکر رہ گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی دولت کا یہ مطلب بھی ہے کہ امن و امان برقرار رکھنے کے لیے ابھی اور چیزوں کی بھی بازی لگانی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بعض دیگر حلقوں کا کہنا ہے کہ مذہبی جنونیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ گذشتہ صدی میں رونما

بعض دیگر حلقوں کا کہنا ہے کہ مذہبی جنونیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ گذشتہ صدی میں رونما ہوئے جن کی حوصلہ افزائی مشرق وسطی اور بر صغیر ہندو پاک میں موجود انتہا پسندوں کی طرف سے کی جارہی ہے۔

ہوئے جن کی حوصلہ افزائی مشرق وسطی اور برصغیر ہندوپاک میں موجود انتہا پسندوں کی طرف سے کی جارہی ہے۔ پنیانگ کی مسلم لیگ تنظیم کے صدر شیخ اسماعیل علاؤ الدین کے بیان کے مطابق پچھلے دس سال کے عرصے میں انتہا پسندوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ حکام نے اس بات سے خبردار کیا ہے کہ اگر مذہبی اور سیاسی دباؤ کو رسنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تو اس سے اقتصادی بدحالی اور گراوٹ کی جڑوں کو ملک کے اندر تقویت ملے گی۔ اخبارات اور ٹی وی میں شائع ہونے والی خبریں اسی تشویش اور فکرمندی کی عکاس ہیں۔ مقامی ٹیلی ویژن اور اخبارات نے اپنی رپورٹوں کو نائب وزیر اعظم انور ابراہیم اور پولس کی اس یقین دہانی تک محدود رکھا کہ اب ہنگامہ فرو ہوچکا ہے۔ اخبارات و ٹیلی ویژن میں فسادات کے دوران لی گئی نہ کوئی تصویر چھاپی گئی نہ کوئی ویڈیو فلم۔ فساد کے ایک دن بعد بس اتنا ہوا کہ مسجد اور مندر کے ان نمائندوں کی ایک تصویر اخبارات میں لگادی گئی جو ایک دوسرے سے مصافحہ کررہے تھے اور تصویر میں داتوک سری انور کو کرخت چہرے کے ساتھ اس منظر کو دیکھتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور ایسا لگتا ہے ترکیب کارگر رہی ہے۔ مقامی تاجروں کا کہنا ہے کہ فسادات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ ملیشیائی مینوفیکچرز کی فیڈریشن کی شمالی شاخ کے صدر کا بیان ہے کہ انھیں قطعاً کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ ہی انہیں کوئی تشویش ہے۔ پنیانگ کا ایک اور تاجر ذرا گھبراہٹ کے لہجے میں یہ کہتا ہے کہ اس فساد کے بارے میں کوئی بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔

ان سب کے باوجود بعض تاجروں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اس پر نظر رکھی ہے کہ ان کی فیکٹریوں کے اندر تصادم کی فضا کے قدم نہ پڑنے پائیں۔ 1990 کی دہائی میں پنیانگ کی معیشت میں گیارہ فیصد کی اوسط سالانہ شرح سے اضافہ ہوا جو کہ پورے ملک کی 8 فیصد شرح نمو سے کہیں زیادہ ہے۔ ملیشیائی حکومت کا قیاس ہے کہ اس سال سالانہ اوسط اقتصادی ترقی میں دو سے تین فیصد کی کمی واقع ہوگی لیکن پنیانگ سے توقع ہے کہ وہاں کی پیداوار کی شرح تمام ریاستوں سے بڑھ کر ہوگی۔ انٹل اور Pen گروپ آف کمپنیز جو جاپان کی Toray Industries Inc. کا ایک یونٹ ہیں ابھی حال ہی میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کے عزم کا اظہار کیا ہے۔

ایک امریکی ملٹی نیشنل پلانٹ کے نسلی ہندوستانی ہندو منیجر کے بیان کے مطابق انہوں نے فساد کے بعد کسی ملائی مسلم ساتھی کے ہمراہ اپنے پلانٹ کے معائنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ اپنے ملازمین کے سامنے متحدہ محاذ کا مظاہرہ کرسکیں جس سے ان کے ڈر خوف اور شکوک شبہات کا ازالہ ہوسکے۔ موجودہ معاشی صورت حال میں ہر آدمی انتظار کرکے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ از سر نو سرمایہ کاری کی روایت کب آئے گی۔ انہوں نے اس اضافے کے ساتھ یہ کہا کہ "یہ حد درجہ سادہ سا یقین دینا ہے اور ہمیں بہت زیادہ محفوظ رہنے کی ضرورت ہے۔"

پولس اور ریاستی حکومت دونوں کو اس بات سے اتفاق ہے کہ اس موقع پر وہ مکمل احتیاط نہ برت سکے۔ کامپونگ راوا میں جو جارج ٹاؤن کا نواحی علاقہ ہے بڑھتی ہوئی کشیدگی فساد سے کئی ہفتے پہلے بھی نمایاں طور پر محسوس کی جارہی تھی۔

جنوری میں ایک عرصے سے قائم راجا متھرا ورن ہندو زیارت گاہ کو جست کی چادر والے چھپر سے ایک ایسے چھوٹے سے مندر میں بدل دیا گیا جس میں سفید ستون اور برج تھا چھت بھی بنائی گئی تھی۔ جھگڑا اس بنا پر ہوا کہ تازہ بہ تازہ تقدیس کا درجہ پانے والا مندر جو کسی کی ذاتی زمین پر غیر قانونی طور پر تعمیر کیا گیا تھا کامپونگ راوا مسجد سے صرف بیس میٹر دور تھا۔

پورے مارچ مسجد میں نماز پڑھنے والے افراد نے احتجاجی جلوس نکالے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مندر میں بجتے ہوئے گھنٹے اور معتقدوں کا بھجن کیرتن ان کی عبادت میں مخل ہورہا ہے۔ فکرمند حکام نے وہاں سے ایک کلومیٹر کی دوری پر مندر کے لیے ایک معقول متبادل جگہ کا انتظام کردیا۔ ہندو فرقے کے سربرآوردہ افراد نے مندر میں آنے جانے والوں کو بتایا کہ انہوں نے حکام سے اچھی سودے بازی کی ہے کیونکہ غیر قانونی طور پر بنایا گیا ان کا چھوٹا سا مندر ایک بڑی جگہ پر منتقل ہوجانے گا جسے وہ اپنا کہہ سکیں گے۔

ہندو پروہتوں کے نزدیک ایک شبھ دن یعنی 26 مارچ کو مورتیاں نئی جگہ پر منتقل کردی گئیں اور جیسا کہ داتوک وجے ناتھن نے بتایا، ان کا خیال تھا کہ معاملہ اتنے پر ہی ختم ہوگیا لیکن اس وقت تک تنازعہ اپنا زور پکڑ چکا تھا۔ قریبی ریاستوں میں اشتعال انگیز پوسٹر بازیوں کا دور شروع ہوگیا جس میں مندر اور مسجد کو نذر آتش یا منہدم کرنے کا الزام لگایا گیا۔ پوسٹروں میں اہل ایمان اور دھرم کے پجاریوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے پنیانگ کا رخ کریں۔

27 مارچ کو جمعہ کی نماز ادا کرنے کرنے کے لیے کامپونگ راوا مسجد میں

ہندو فرقے کے سربرآوردہ افراد نے مندر میں آنے جانے والوں کو بتایا کہ انہوں نے حکام سے اچھی بازی کی ہے کیونکہ غیر قانونی طور پر بنایا گیا ان کا چھوٹا سا مندر ایک بڑی جگہ پر منتقل ہوجائے گا جسے وہ اپنا کہہ سکیں گے۔

نمازیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ پولس کا کہنا ہے کہ ان کی تعداد ڈیڑھ سے دو ہزار تک رہی ہوگی جب کہ مسجد میں پانچ سو افراد کی ہی گنجائش ہے تاہم بعض عینی مشاہدین کے بیان کے مطابق یہ تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی۔ پولس نے یہ بھی بتایا کہ ان نمازیوں میں صرف ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ کیواہ اور پراک جیسی دوردراز کی ریاستوں سے آئے ہوئے ملائی مسلمان بھی تھے۔

نماز جمعہ سے فارغ ہوکر کئی سو مسلمان مسجد کے احاطے سے ایک لہر کی طرح نکلے اور مندر کی جگہ کی طرف بڑھے جس کی نگرانی دو تین سو ہندو کر رہے تھے۔ فساد شکن پولس کی تعداد ان کے مقابلے میں بہت کم ہوگئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سنگ باری میں پولس ریکارڈ کے مطابق چار افراد زخمی ہوئے۔ موقع پر موجود ایک شخص نے بتایا کہ آنسو گیس پٹاخوں کی طرح چھوٹ رہی تھی۔

اگلے چند دن اکادکا واقعات جاری رہے جن میں مسجد، ہندو مندر اور دو کانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ جارج ٹاون میں چار موٹر سائیکل سوار نوجوانوں نے ایک ہندو عبادت گاہ پر آگ کا گولہ پھینکا۔ مندر کے بوڑھے نگراں کرشنن نے بتایا کہ آگ کی لپٹیں چھت کو چھو رہی تھیں اس لیے وہ اپنی کوٹھری میں دبک گیا اور جب چاروں نوجوان وہاں سے چلے گئے تبھی وہ باہر نکل کر آگ پر ڈول کے ڈول پانی پھینک سکا۔

پولس کا کہنا ہے کہ کل 185 افراد کو حراست میں لیا گیا جن میں سے اکثر ضمانت پر رہا کر دئے گئے لیکن فساد میں ملوث 25 افراد کو تفتیش مکمل ہونے تک حراست میں رکھا جائے گا۔ ذمہ داران کو اس کا احساس ہے کہ انہیں پہلے ہی حرکت میں آنا چاہئے تھا۔ خوش قسمتی سے ہنگامے پر بہت کم وقت میں قابو پالیا گیا۔ اس خیال کا اظہار پنیانگ کے چیف پولس افسر داتوک عبد الحمید مصطفی نے کیا۔

جب بھی کوئی نسلی یا مذہبی تنازعہ کھڑا ہوتا ہے تو پولس عموماً پوری طرح چوکنی ہوجاتی ہے اور اگر اسکول کے احاطے دو مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے طلباء میں بھی کوئی مڈبھیڑ ہوتی ہے تو اسے بھی ریکارڈ پر لائی ہے۔ داتوک عبد الحمید کا کہنا ہے کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ 13 مئی کا واقعہ ذہنوں سے محو نہیں ہوا ہے۔ □

کہیں آپ روٹری کلب کی رکنیت کو باعث اعزاز تو نہیں سمجھتے؟

یہودیوں کے سازشی اڈے روٹری کلب سے پردہ اٹھانے والی چشم کشا تحریر

ترجمہ: عظریف شہباز ندوی

روٹری کلب، اس کی ذیلی انجمنیں اور اس کے مماثل لائنز، کلب ابنائے بیرث اور دوسری مختلف ماسونی انجمنیں فی الوقت عالم اسلام اور عالم عرب کے بہت سے ملکوں اور علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ان تنظیموں سے ان ملکوں و معاشروں کی اہم اور بااثر شخصیات بھی بڑی تعداد میں وابستہ ہیں، جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ان عالمی ایجنسیوں اور تنظیموں کے خوش نما نعروں اور دل فریب طریقہائے عمل سے دھوکہ کھا کر اکثر لوگ حسن نیت کے ساتھ ان سے جڑ جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ یہ تنظیمیں اپنے خفیہ مقاصد اور مفادات کے لیے ان کا استعمال کر رہی ہیں۔ روٹری کلب بظاہر ایک سماجی اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم ادارہ ہے لیکن اس کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ دراصل فری مین اور صہیونی تحریکوں کا ہی ایک حصہ ہے چنانچہ کلب کے آغاز کی کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ سوئیڈن میں منعقدہ پہلی یہودی کانفرنس میں فلسطین کے اندر یہودیوں کے لیے ایک مستقل قومی ریاست کی تشکیل کی علانیہ قرارداد پاس کی گئی اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف خفیہ طریقہائے کار اور اسٹریٹیجیز پر عمل درآمد کرکے فیصلہ کیا گیا جس میں غالباً سب سے اہم صہیونی سازشوں کی مکمل دستاویز کی تحریر و ترتیب ہے، جو دراصل دنیا بھر کی حکومتوں کو ختم کرکے ان کی جگہ ایک عالمی یہودی تسلط کی باضابطہ پلاننگ سے عبارت ہے۔ ان پروٹوکولز کو انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا اسی وجہ سے جب ایک فرانسیسی خاتون اپنے ایک صہیونی دوست سے تعلقات کی بنیاد پر اس دستاویز کو چرانے اور انھیں بھی روس لے کر جانے میں کامیاب ہوگئی تو پوری صہیونی دنیا لرز اٹھی تھی اور اس نے اپنے تمام خفیہ اور علانیہ ذرائع اس کا پتہ لگانے پر صرف کر دئے تھے تاہم جب روسی اسکالر سرجی نیلوس نے 1902 میں اس دستاویز کو روسی زبان میں شائع کر دیا اور پھر اس کے کئی زبانوں میں ترجمے کئے گئے تو اب تک صہیونیت سے الگ سمجھی جانے والی ماسونی تحریک صہیونیت کے ساتھ گہرا ربط و تعلق رکھنے اور اسی کے اغراض و مقاصد کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہونے کی حیثیت سے بے نقاب ہوگئی لہذا نئی اسٹریٹیجی کی تشکیل کے لیے صہیونیت کے عالمی فکری رہنما ہرٹزل نے عالمی صہیونی کانفرنس منعقدہ 1903ء میں ماسونیت کے طرز پر مزید ادارے، انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم کرنے کا اشارہ دیا، جس کی تعمیل میں 1905ء میں روٹری کلب کا قیام عمل میں آگیا۔ کلب کی پہلی انجمن شکاگو میں تشکیل کی گئی جس کی سربراہی ایک امریکن یہودی وکیل پال ہارس اپنے کچھ دوستوں کے تعاون سے کر رہا تھا۔ انجمن نے اس بات کا اعلان کیا کہ اس کی سرگرمیاں مذہب و سیاست سے ہٹ کر خالص انسانی، ثقافتی اور معاشرتی ہوں گی اور اس کی رکنیت کسی کام، پیشہ وغیرہ کے نمائندہ وابستگان کو دی جائے گی۔ فری مین یہودیوں کے ایک بڑے ہجوم میں اس کا پہلا اجتماع ہوا جس میں پال ہارٹس نے اپنے دوست سیلپر چیلر کا نام پہلے عالمی روٹری کلب کے سربراہ کے طور پر پیش کیا اور سیبولی لیرل کو اس کا سیکریٹری بنایا گیا۔ کلب کی دوسری شاخ سان فرانسسکو میں، تیسری نیویارک میں اور چوتھی واشنگٹن میں کھولی گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہی مقامات عالمی فری مین مراکز بھی تھے۔

تاسیس کے بعد جب یورپ اور خاص طور پر برطانیہ میں کلب نے پیر جمانے شروع کیے تو بالتدریج اپنے وجود کے اظہار کے ساتھ ہی دنیا بھر میں پہلے اپنے کارکنوں کی سرگرمیوں اور روابط کو بہتر بنانے کی خاطر 1922ء میں کلب کا ایک امتیازی نشان بھی مقرر کیا گیا جس کو دقت نظری کے ساتھ دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ماسونیت و صہیونیت کی ترجمانی کر رہا ہے کیونکہ روٹری کلب کا یہ نشان نیلے سنہری رنگ میں 24 دانتوں والے کمان دار پہیے کی شکل پر بنا ہوا ہے اور یہ دونوں رنگ یہودیوں کے ہاں

مقدس سمجھے جاتے ہیں۔(1) انھیں سے وہ اپنے عبادت خانوں، ہیکلوں اور مذہبی مجالس کی تزئین کرتے ہیں۔(2) پینے کے بیچ میں آنکھ کی شکل کا سوراخ بنا ہوا ہے جس کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہودی آنکھ مسجد اقصیٰ کی جگہ پر ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے غافل نہیں ہے۔

نشان میں 6 لمبی شاخیں بھی بنائی گئی ہیں جو اسرائیل کے چھ کونوں والے قومی ستارے کا رمز ہیں۔ اس کے گرد روٹری کلب کا نعرہ لکھا جاتا ہے۔ کلب کا ہر ممبر یہ نشان اپنے پاس رکھتا ہے۔ عالم عرب کے خطہ کو یہ لوگ علاقہ نمبر 245 کا نام دیتے ہیں جس میں مصر، سوڈان، قبرص، اردن، لبنان وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بات خاصی قابل غور ہے کہ مذکورہ منطقہ میں روٹری کلب کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی مختلف بحرانوں کی آمد آمد شروع ہوگئی۔ قبرص کی تقسیم سوڈان میں بغاوت، لبنان کی خانہ جنگی، مصر میں بڑھتی فرقہ وارانہ منافرت، یہ ایک ایسا راز ہے کہ جب اس سے پردہ اٹھے گا تو ایک لرزا دینے والی روداد سامنے آئے گی۔ روٹری کلب کے عالمی سربراہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ برطانیہ میں کلب کی رکنیت صرف فری میسن سے جڑے لوگوں کو دی گئی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ روٹری کلب درحقیقت ماسونیت اور صیہونیت کے لیے ہی کام کرتا ہے، مزید برآں یہ کہ دنیا بھر میں کلب کی تمام شاخیں ماسونیت کے ہی بہت سے رموز و علامات کا استعمال کرتی ہیں۔ مثلاً گیہوں کی بالی، جو ماسونی اصطلاح میں ہیکل سلیمانی کی فصیل پر نقش شدہ 12 اسرائیلی قبائل کے متحدہ علم کے نیچے تمام یہودیوں کے اجتماع و اتحاد سے عبارت ہے اور جیسے سورج کا طلوع جو اس ستارے کی تضحیک ہے جس نے یہودی روایات کے مطابق مسیح کی پیدائش پر مجوسیوں کو جائے ولادت کے طواف کے لیے رہنمائی کی تھی۔ یا مثلاً مصافحہ کرتے دو ہاتھ جو بظاہر امن و سلامتی کا رمز ہیں لیکن ماسونی اصطلاح میں اس سے مراد فلسطین میں بنی اسرائیل کی واپسی اور ہیکل کی تعمیر ہوتی ہے نیز آنکھ کی علامت کا استعمال جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہودی ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے غافل نہیں بلکہ اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

کلب کی انجمنیں خطہ کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو خیرسگالی کے دفود کے طور پر امریکہ وغیرہ بھیجنے کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ جس کا سب سے معنی خیز پہلو یہ ہے کہ ایسے کسی بھی وفد میں شامل لڑکے یا لڑکی کو اپنے سفر کے ایام کسی یہودی گھرانے کے ساتھ گزارنے ہوتے ہیں۔

عالم عرب میں روٹری کلب نے خفیہ طور پر پنجے گاڑے تھے۔ مدتوں خفیہ انداز میں کام کرتے رہنے کے باعث انھیں کسی رد عمل کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بعد میں متعدد عرب حکومتوں نے جامعہ ازہر اور مکہ مکرمہ کی عالمی اسلامی فقہ اکیڈمی کے روٹری کلب و لائنز کلب میں مسلمانوں کی شمولیت کی تحریم کے فتوے کے بعد ان تنظیموں کی سرگرمیوں پر پابندی عاید کردی تھی لیکن فی الوقت خلیج کی کئی ریاستوں میں ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اردن اور اسرائیل کے مابین امن معاہدہ کے بعد اب روٹری کلب آزادانہ طور پر وہاں کام کر رہا ہے اور میڈیا صحافت اور رفاہی خدمات کے ذریعہ سے وہ بھرپور انداز میں سامنے آرہے ہیں۔ مصر نے 1964ء میں روٹری کلب بند کردیا تھا لیکن کیمپ ڈیوڈ کے معاہدہ کے بعد اب وہ وہاں پر سرگرم ہے بلکہ ان دنوں تو روٹری کلب کا عالمی مرکز بھی قاہرہ میں واقع ہے۔ روٹری کلبس ادب آرٹ اور صحافت سے وابستہ مشاہیر فن کو کلب سے قریب لانے اور اس میں ان کی شمولیت کا بطور خاص اہتمام کرتے ہیں کیونکہ ایک طرف تو ان مشاہیر کے کلب کا ممبر ہوجانے سے عام لوگ ان کی سرگرمیوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ دوسرے انھیں ان مشاہیر کے حوالہ سے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اپنے خیالات و نظریات کو پوری قوت کے ساتھ پھیلانے کے مواقع حاصل ہوجاتے ہیں۔

عالم عرب میں بطور خاص یہ تنظیمیں فی الوقت یہودیوں کے چندیہ حق ہونے کی نظریہ ترویج اور اس جھوٹ کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں کہ فلسطینیوں نے خود اپنی زمینیں یہودیوں کو فروخت کی ہیں۔ وہ بطور خاص اس پہلو پر پورا زور صرف کر رہے ہیں کہ خطہ میں امن و امان کی بحالی اور معاہدہ امن کے لیے فضا ہموار کرنے کے بہانے عام لوگ اسرائیل کے وجود کو ایک حقیقت واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اسی کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کرنے کے حق میں ہوجائیں۔ اسی ضمن کی ایک کوشش یہ بھی ہے کہ کلب کی انجمنیں خطہ کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو خیرسگالی کے وفود کے طور پر امریکہ وغیرہ بھیجنے کا اہتمام بھی کرتی ہیں، جس کا سب سے معنی خیز پہلو یہ ہے کہ ایسے کسی بھی ٹور میں وفد میں شامل لڑکے یا لڑکی کو اپنے سفر کے ایام کسی یہودی گھرانے کے ساتھ گزارنے ہوتے ہیں۔ □

مغرب میں اسلام کا مطلب ہے تشدد

اسلام کے خلاف مغرب میں پائی جانے والی غلط فہمیوں پر ایک تبصرہ

تحریر: پال فونڈلی

سات سال پہلے اور اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پیشتر جیکسن پال کے الینوی کالج کے اخلاق اور دینیات کے ریٹائرڈ استاذ مالکم اسٹیوارٹ جو قریبا 50 سال پہلے میرے استاذ تھے، نے اسلام اور مغرب کے مابین افہام و تفہیم کی ضرورت کے موضوع پر میرے ایک مقالہ کی تائید میں مختصر مگر جامع تحریر لکھی تھی۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ ان کی رائے میں دنیا میں امن و سلامتی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ مختلف مذاہب کے مابین خوشگوار روابط پیدا نہیں ہوتے جو مختلف ادیان و مذاہب کے پیروکاروں کے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوششوں پر منحصر ہیں۔ ان کے نزدیک موجودہ دنیا میں یہ تفاہم مشکل تو نظر آتا ہے لیکن یہ ایک اچھی علامت ہے کہ اسی سلسلہ میں ہمیں مختلف مذاہب سے تعاون کی امید ہے۔ باہمی تفاہم کے لیے پروفیسور موصوف کے نزدیک اہم اور بنیادی بات مختلف ادیان و مذاہب کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کی بجائے مسلمات اور مشترک قدروں پر زور دینا ہے۔ یقینا تینوں آسمانی مذاہب اسلام عیسائیت اور یہودیت کی تعلیمات میں جوہری اختلافات پائے جاتے ہیں اور انھیں کو عام طور پر اچھالا بھی جاتا ہے لیکن اسی طرح بہت سے بنیادی مشترک مسلمات اور یکساں اتفاقی امور بھی پائے جاتے ہیں جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ باہمی مفاہمت اور تعاون کے راستہ میں ایک دوسرے سے ناآشنائی اور اس کے نتیجہ میں اندھا تعصب سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی جادوی سہولیات نیز اجتماعی میدانوں میں زبردست مطالعات و تحقیقات کے باوصف جہل اور بے جا تعصب ابھی بھی امن و سلامتی کا خطرناک ترین دشمن بنا ہوا ہے۔ اس کی سب سے واضح تر مثال یہ ہے کہ ولایت متحدہ امریکہ کے عیسائی اسلام کے بارے میں قطعی لاعلمی اور گمراہی میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک خوفناک حقیقت ہے اور تاریخ میں اس کی کم مثالیں ملیں گی۔ اس حقیقت کی تائید میں میں بطور خاص چند عوامل کی نشاندہی کرنا ضروری ہے۔ اس بے خبری اور گمراہ کن پروپیگنڈے کا اصل منبع موجودہ سپر پاور امریکہ بنا ہوا ہے جب کہ اپنے اس مقام سے امریکہ دنیا کے مختلف ملکوں بطور خاص شرق اوسط کے تعاون اور قیادت کا فرض انجام دے سکتا تھا، جس کے شہر ممالک اسلحہ، خوراک، ملکی دفاع اور مختلف میدانوں میں تربیت و ٹریننگ کے لیے امریکہ ہی پر انحصار کرتے ہیں۔

دوسری اہم چیز یہ ہے کہ امریکہ کی شرق اوسط کی پالیسی اسلام مخالف رجحانات سے خاصی متاثر ہے کیونکہ یہی رجحانات مغرب میں اسرائیل نوازی کے نمائندہ ہیں جو اکثر اسلام اور مسیحیت و یہودیت کے مابین اختلافات کو عمومی طور پر بڑھا چڑھا کر

پیش کرتے ہیں، یہی نہیں بلکہ اسلامی خطرہ کو باوزن بنانے کے لیے اسلام کی تصویر بگاڑنے کے ساتھ ہی اسلام اور مغربی تہذیب کے مابین مفروضہ تصادم کی بات بھی بڑی قوت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے تو ایسی صورت حال کا اصل سبب اسرائیل کی یہ ضرورت ہے کہ ایک مشترک دشمن سامنے رکھنے سے امریکہ اسرائیل کو سیاسی، معاشی، فوجی اور ڈپلومیٹک تعاون یقینی بنائے رکھا جائے بالخصوص ایسی صورت میں کہ سوویت یونین جو اسرائیل اور مغرب دونوں کے لیے بیک وقت مشترک دشمن تھا، سوویت یونین کے بکھر جانے کے بعد وہ اب ختم ہو گیا ہے لہذا اسرائیل کی حامی لابی کی یہ مجبوری بن گئی کہ وہ اسلام کو مشترک دشمن کی حیثیت سے سامنے لائیں جب کہ یہی لابی امریکی سیاست پر سب سے زیادہ اثر انداز ہے۔ یہاں پر یہ اشارہ کرنا ضروری ہوگا کہ 1984ء اسرائیل کے قیام کے بعد چند قلیل وقفوں کو چھوڑ کر امریکہ اسرائیل کی بے تحاشا مدد کرتا رہا ہے۔ گزشتہ 30 سالوں سے امریکہ کی اسرائیل کے لیے امداد میں مسلسل زبردست اضافہ ہوا ہے۔ امریکی کانگریس کے رول کے بارے میں آنجہانی سفیر جارج نے ایک گہری بات یہ کہی تھی کہ جب بھی شرق اوسط بحث کا موضوع بنا کانگریس کا عمل پولو کے تربیت یافتہ کتے کا ہوتا تھا جو گلے میں بندھے پٹوں کے ساتھ اچھل کر رہے ہوں جو یہودی لابی نے پکڑ

رکھے ہوں۔ دیکھا جائے تو انتظامی بوڈی کے ذمہ داران کی یہی پوزیشن ہے۔

واضح رہے کہ اسرائیل کے لیے یہ زبردست اور لگاتار امداد اسرائیل کی وسیع پیمانے پر حقوق انسانی کی خلاف ورزی وغیر یہودیوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف اسرائیل کے نسلیت پر مبنی رویہ کے باوجود جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی قوم ایک ایسی اجنبی حکومت کو سرمایہ فراہم کررہی ہے جو ہماری سوسائٹی میں تسلیم شدہ انسانی قدروں کو پامال کررہی ہے۔ تیسرے یہ کہ ترقی یافتہ مغربی ایجنسیاں اور ذرائع ابلاغ اسلام کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈے اور تعصب کے رویہ میں آخری حد تک جا پہنچے ہیں حالانکہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں مغربی قومیں اور عالم اسلام کی عرب اور غیر عرب قومیں جو ماضی میں عملاً ایک دوسرے سے جدا تھے، آج پڑوسی اور ہمسائے بن گئے ہیں۔ زندگی اور انسانی قوتوں کو ایک سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور ان دونوں ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے مابین تعاون ہم آہنگی اور اتحاد کے راستے ڈھونڈے جائیں۔ یہیں سے مجھے دیئے گئے موضوع "اسلام مغرب میں کیسے دیکھا جاتا ہے" کی اہمیت بھی واضح ہوجاتی ہے۔ اس ضمن میں میرے جوابات کو غالباً امریکی نقطہ نظر کی حیثیت سے لیا جائے گا کیونکہ باوجود اس کے کہ امریکہ مغرب کا ایک جزء ہے لیکن مغرب کی سب سے بڑی قوت ہونے اور اسرائیل کے ساتھ خصوصی تعلق کی بنیاد پر وہ ایک اہم جزء ہے اور اس کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک مسیحی ہونے کی حیثیت سے میرے نقطہ نظر کو امریکی عیسائیوں کی ترجمانی سمجھا جائے گا۔ جہاں تک امریکی یہودیوں کے نقطہ نظر کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ جب بھی میں USA میں لیکچر وغیرہ دیتا ہوں تو اکثر میں سامعین سے اسی طرح کے سوالات کرتا ہوں کہ لفظ "مسلم" بولنے سے آپ کے ذہن میں کیا متبادر ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر جواب یہ ہوا کرتا تھا کہ "تشدد" گویا کہ عام بول چال میں مسلم اور تشدد ایک دوسرے کے متعلق بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ یہ ترادف غلط اور فطری طور پر حملہ آورانہ ہے۔

المناک ٹریجڈی ہے کہ اکثر امریکی اسلام کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کا بڑا سرچشمہ گردانتے ہیں۔ عمومی طور پر مسلمانوں کی تصویر ایک مجرم کی اور یہودیوں کی جرم کے ایک بے قصور نشانہ کی بنادی گئی ہے۔ مسلمانوں کو بالعموم ایک عجیب سے خدا کا عبادت گزار اور دوسرے مذاہب کے خلاف متعصب اور جسمانی قوت کے ذریعہ اسلام کی نشر و اشاعت کرنے والا تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عام طور پر مسلمانوں کو جمہوریت اور امریکی قانون کے لیے بھی خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کی امریکی شہریت سے وفاداری میں شک کرتے ہیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی رائے میں اسلام یہودیوں کا مخالف اور سیاہ فام نسل کے مفادات کے تئیں جانبدار ہے۔ یہ مؤخر الذکر رائے دراصل فرح خاں اور ان کی تنظیم امت اسلام کے تصور اسلام کہ اسلام افریقی نژاد لوگوں کے لیے ہے۔ کے تاثر سے پیدا ہوئی ہے جب کہ میرا خیال ہے کہ مسلمان عام طور پر بشمول افریقی نژاد لوگوں کے۔ فرح خاں کے اسلام میں بھی شک کرتے ہیں لیکن چونکہ عام طور پر لوگ امریکن ٹیلیویژن پر فرح خان کو ہی دیکھتے ہیں جو اپنے کو مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش بھی کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کچھ امریکی اسلام کو فرح خان کی عینک سے ہی دیکھنے لگیں تو کوئی تعجب خیز بات نہیں۔

مزید برآں ان امریکیوں کی اکثریت کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ انھیں مردوں سے کم درجہ دیتا ہے اور ان کی حیثیت گھٹا دیتا ہے پھر ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے بھی شاذ و نادر ہی کچھ ہوتا ہے چنانچہ باوجود اس کے کہ مسلمان امریکہ میں مذہباً دوسرے نمبر پر ہیں اور ان کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ ہورہا ہے۔ پھر بھی عمومی سیاست میں ان کا کوئی اثر و نفوذ ابھی تک نہیں ہوا۔ ابھی وہ وجدانی سلبی طریقہ سے اپنے دفاع میں لگے ہیں۔

کسی جمہوری منصب پر کوئی مسلمان نہیں آتا نہ ہی کسی ریاست میں اور نہ ہی پورے فیڈرل نظام میں کسی اہم ذمہ داری پر مسلمان فائز ہوتا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پہلے درجہ کے شہریوں میں شمار کی جاتی ہے تاہم وہ اپنی رائے اور اپنے حق کا اظہار کرنا نہیں چاہتے اور اپنے احباب و ہم سایوں سے اپنے دینی تعلق تک کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار میں نے ایک مصری نژاد مسلم دوشیزہ سے سوال کیا کہ اسلام کے تئیں غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے وہ کیا کریں گی تو اس نے کہا کہ وہ اپنے عملی نمونہ سے ان کا جواب دینے کو ترجیح دیتی ہیں۔ انفرادی عملی نمونہ بہت اچھی چیز ہے لیکن میری رائے میں وہ اسلام کے خلاف ایک منظم حملہ کا سامنا کرنے کے لیے کافی نہیں۔ مسلمانوں کو امریکہ کے سیاسی نظام میں مثبت حصہ لینا چاہئے۔ جس طرح اسرائیل کی ہمنوا لابی اسے اپنے حق میں استعمال

امریکی کانگریس کے رول کے بارے میں آنجہانی سفیر جارج نے ایک گہری بات یہ کہی تھی کہ جب بھی شرق اوسط بحث کا موضوع بنا کانگریس کا عمل پولو کے تربیت یافتہ کتے کا ہوتا تھا جو گلے میں بندھے پٹوں کے ساتھ اچھل کررہے ہوں جو یہودی لابی نے پکڑ رکھے ہوں

باقی صفحہ ۲۳ پر

فلپین میں مسلم انقلابیوں کو نئی مہم کا سامنا

نور مسوری دوسرے یاسر عرفات ثابت ہورہے ہیں

فلپائن فلپائن کے وسطی منڈانو میں واقع فوجی پریڈ گراونڈ میں 43 سالہ معلم مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے تربیت خواہوں کو لاوڈ اسپیکر پر ہوتی ہوئی تلاوت قرآن کی گونج میں پریڈ کرا رہا ہے۔ پریڈ گراونڈ میں بنے اس کے لکڑی کے کیبن میں مکہ معظمہ اور دیگر مقامات مقدسہ کی تصاویر آویزاں ہیں۔ تربیت خواہوں میں فرنٹ کے 430 افسر ہیں جن پر وہ ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ فرنٹ کے اس کیمپ میں جس کا نام ابوبکر رکھا گیا ہے یہ نوجوان تربیت پاکر شمالی اور مغربی منڈانوں میں اپنے یونٹوں سے جا ملیں گے۔ یہ سرگرمی ایک ایسی جنگ کی تیاری ہے جو جنوبی فلپائن کے مورو کہلائے جانے والے مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے ایک علیحدہ ریاست نہ دئے جانے کی صورت میں ناگزیر ہوجائے گی۔

یہ سن کر تعجب اس بنا پر ہوتا ہے کہ ابھی دو سال پہلے ایم این ایل ایف کے لیڈر نور مسواری کو مسلم منڈانو خود مختار علاقے (اے آر ایم ایم) کا گورنر منتخب کیا گیا تھا اور چوبیس سال کی کشمکش سے گزرنے کے بعد ریاست کو معاشی استحکام ملنا شروع ہوا تھا کہ اٹھارہ ماہ بعد منڈانو پھر دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔

خود مختاری کا تجربہ اس اعتبار سے ناکام ثابت ہوا ہے کہ مسواری اپنے عہدے کی ذمہ داریاں نبھانے کے بجائے ملکوں ملکوں گھوم کر دولت جمع کرنے میں مصروف رہے ہیں جس سے انتظامیہ بد عنوانی کا شکار ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایم آئی ایل ایف نام کی شدت پسند تنظیم جو 1978 میں ایم این ایل ایف سے علیحدہ ہوئی تھی اپنے علیحدگی پسندی کے موقف پر سختی سے قائم رہی ہے۔ جب اس کے لیڈروں کو دو سال پہلے مسواری نے آے آر ایم ایم میں شریک ہونے پر آمادہ کرنا چاہا تو انہوں نے مسواری کی حکومت نوازی پر تنقید کرتے ہوئے اس پیش کش کو مسترد کردیا۔ ان عناصر کا اپنے قدیم مرکز ماگز ڈانو میں خاصا اثر ہے اور پہلے سے ایم این ایل ایف سے متاثر بعض علاقوں مثلاً زمبونگا اور بیلان تک بھی ان کی رسائی ہے۔

وہ دن دور نہیں جب ایم آئی ایل ایف اس علاقے میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے گی، اس کا اندازہ کوٹا باٹو شہر کے نواح میں اسلام کی دعوت دینے کے لئے اجتماعی ریلی اور محاذ کی پندرھویں کانگریس سے ہوتا ہے جسے بیسوں سال سے مشرق وسطی میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے لیڈر سلامت ہاشم نے خطاب کیا۔ کوٹا باٹا شہر کے مضافاتی جنگل میں ایم آئی ایل ایف نے ایک ایسا علاقہ گھیر رکھا ہے جو فوجی اڈہ بھی ہے اور اس کی مطلوبہ ریاست کا مرکز بھی۔ فرنٹ کے فوجی چیف آف اسٹاف الحاج مراد ابراہیم کا کہنا ہے کہ وہ اپنا الگ عدالتی قانونی اور فوجی نظام نافذ کریں گے

☆ ابوبکر کیمپ میں مسلم انقلابیوں کی تربیت کا ایک منظر

15000 افراد کی آبادی پر مشتمل اس فوجی اڈے پر پہنچنے کے لیے کسی کو پاسپورٹ کی ضرورت تو نہیں ہے، ہاں چیک پوائنٹ پر اپنا نام ضرور درج رجسٹر کرنا ہوگا جہاں سے علاقے کی شروعات ہوتی ہے اور جہاں ایم۔ 16 بردار نوجوان آپ کا استقبال کرے گا۔ یہاں بازار بھی ہیں، ریستوران بھی، پرائمری اسکول بھی ہیں اور مدرسہ بھی جن میں لڑکے اور لڑکیاں بیٹھتے ایک ہی کمرے میں ہیں لیکن بیچ میں پردہ حائل رہتا ہے اور مدرس کا روئے سخن دونوں کی طرف رہتا ہے۔ مدرسے کے 35 سالہ سربراہ یا ڈائرکٹر محمد اسماعیل ایک کامیاب تاجر تھے جن کی کایا پلٹ ایک دعوت پروگرام میں شرکت سے ہوئی اور پھر وہ ابوبکر کیمپ میں آگئے۔ یہاں جیسا کہ ان کا بیان ہے دنیا کی دولت کے مقابلے میں بہت آرام اور سکون ہے۔ گذشتہ جولائی میں حکومت کے ساتھ انتہا پسندانہ سرگرمیوں کے خاتمے کے معاہدوں کے باوجود جنگی کیمپوں میں فوجی تیاریاں زور پکڑتی جارہی ہیں اور فلپائنی فوجی ذرائع کے مطابق ان کیمپوں میں آٹھ سے پندرہ ہزار باغیوں کی تربیت ہوچکی ہے، جن کے پاس

مختلف ذرائع سے حاصل کیے ہوئے خود کار اسلحے ہیں اور وہ خود بھی اسلحہ سازی میں مصروف ہیں۔

ایک سینئر فوجی کمانڈر کے مطابق علاقے میں سلامت ہاشم کی اچانک موجودگی اور اس کی خفیہ کارروائیوں اور نوجوانوں سے مذہب کے نام پر ان کی اپیل سے علاقے میں ایم آئی ایل ایف نے سنگین مسائل پیدا کردئے ہیں۔ پچپن سالہ ہاشم سلامت جنھوں نے 1926 میں مورو لبریشن فرنٹ قائم کیا تھا۔ مورو سیاست کو انقلابی اسلامی تعلیمات سے جوڑنے کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔ مصر کی جامعہ ازہر میں تعلیم یافتہ اس لیڈر کو 1970ء میں سیاسی تشدد کی لہر کے دوران گرفتار کیا گیا تھا جب مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر کے خلاف الاگا، تحریک کے تحت عیسائی قوتیں یکجا ہوگئی تھیں۔ اس واقعے نے ہاشم اور منڈانو مسلم برادری کی یادداشت پر گہرا نقش چھوڑا تھا۔

1927ء میں فلپائن یونیورسٹی میں لیکچرار مارکسی رجحانات رکھنے والے نور مسواری کی قیادت میں ایم این ایل ایف جنگوں سے ابھری۔ اس وقت مسلم نوجوان دو خانوں میں منقسم تھے یعنی فلپائن یونیورسٹی جیسے سیکولر اداروں کے فارغین اور مقامی مدرسوں اور عرب ممالک کے اداروں کے تعلیم یافتگان۔ مورو تحریک میں سیکولر اور مذہبی رجحانات کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے میں نسلی اور سیاسی عوامل کا بڑا ہاتھ تھا۔ 1987ء میں ایم این ایل ایف کے جلاوطن وزیر خارجہ ہاشم نے اپنے حامیوں کے ساتھ ایک علیحدہ سنٹرل کمیٹی قائم کرلی اور یہی 1948ء میں ایم آئی ایل ایف بن گئی۔

آج چودہ سال بعد بھی ہاشم اس مقصد کی راہ پر گامزن ہیں جس کا انتخاب انھوں نے اور مسواری نے ایک ساتھ کیا تھا یعنی منڈانو میں ایک مسلم ریاست کا قیام۔ ہاشم کی واپسی سے پہلے بھی ایم آئی ایل ایف ابوبکر کیمپ کے اطراف میں سرکاری فوجوں سے برابر متصادم ہوتی رہی ہے۔ گذشتہ جولائی میں فرنٹ کے راجا موڈا کیمپ میں

مدرسے کے 53 سالہ سربراہ یا ڈاکٹر محمد اسماعیل ایک کامیاب تاجر تھے جن کی کایا پلٹ ایک دعوت پروگرام میں شرکت سے ہوئی اور پھر وہ ابوبکر کیمپ میں آگئے۔ یہاں جیسا کہ ان کا بیان ہے دنیا کی دولت کے مقابلے میں بہت آرام اور سکون ہے۔

ہیلی کاپٹروں سے فوجی حملے کے بعد بغاوت کے خاتمے کا معاہدہ عمل میں آیا تاہم سرحدی کنٹرول کے موضوع پر گفتگو کے دوران ہی اکادکا جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔ فلپائنی فوجی صفوں میں گھبراہٹ کی کیفیت خاصی نمایاں ہے کیونکہ سلامت ہاشم حکومت کے خلاف جنگ کا نعرہ دینے کے موقف پر اڑے ہوئے ہیں۔ فلپائنی بریگیڈیر جنرل رونالڈ بتسیا جو ایک تجربہ کار افسر ہیں اور کوٹا باٹا کی چھٹی ڈویژن کی کمانڈ سنبھالے ہوئے ہیں، ان کا خیال ہے کہ ایم آئی ایل ایف سے حکومت کی مذاکرات کی پالیسی انھیں مزید استحکام بخشے گی اور اس کے خلاف اقدام میں تاخیر کا باعث بھی ہوگی۔ دوسری جانب فرنٹ کے ذمہ داران بھی یہ اندازہ کررہے ہیں کہ حکومت ان طریقوں سے ان پر حملے کی تیاری کا موقع حاصل کررہی ہے اور اسی لیے ہاشم کا کھلا اعلان ہے کہ اگر حکومت ہمارے کسی کیمپ پر حملہ آور ہوتی ہے تو پورے منڈانو میں جنگ برپا ہوجائے گی۔

☆ مسلم انقلابی اسلحہ کے ایک ورکشاپ میں مصروف

لیکن ابھی ایسا ہونے والا نہیں ہے، وجہ اسی کی یہ ہے کہ دونوں فریق جانتے ہیں کہ وہ جنگ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ فلپائنی حکومت نے ایم این ایل ایف کے ساتھ جس جانفشانی سے معاہدہ کیا ہے اس کے امکانات اور فوائد کے ساتھ ہی دوسری طرف ایم آئی ایل ایف کے ذمہ داران بھی اس وقت سیاسی حقیقت پسندی کو مذہبی جنون پر ترجیح دے رہے ہیں اور اسی سے ان کے منشور کا تعین ہورہا ہے۔ ایک مغربی فوجی افسر کے بیان کے مطابق جنگ کی دھمکی سے ایم آئی ایل ایف کو کسی اور مقصد کے مقابلے میں سیاسی مفادات زیادہ حاصل ہوں گے۔

حکومت نے صلح وامن کے حصول کی ذمہ داری ریٹائرڈ آرمی کمانڈر ان چیف لیفٹیننٹ جنرل آرلینڈو سورباتو کو سونپی ہے جن کا طریقہ کار حد درجہ روایتی ہے جس کے تحت وہ ایم آئی ایل ایف سے مذاکرات کے بیچ بیچ میں بقول خود اعتماد جیتنے کی کوشش میں ان کے علاقے کو ترقی یافتہ بنانے کا منصوبہ پیش کرتے ہیں۔ ابھی فروری میں سوربارتو نے جاپانی کفالت میں کارمن ٹاون میں لگے ایک سینچائی پروجکٹ کا افتتاح کیا۔ ایم آئی ایل ایف کے کسان جو کل تک جنگجو تھے ان سے وہ چاول کی فصل کی بہتری اور بند کی تعمیر پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے امن کی ضرورت اور اس کے امکانات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں اور اسی پس منظر میں فوجی دستوں کا گشت بھی جاری ہے۔ ایم آئی ایل ایف کیمپ کے علاقے میں سینچائی اور شاہراہ

پروجیکٹ کے لیے بالترتیب ساڑھے سات اور پانچ لاکھ ڈالر کی رقوم جاری کی جا چکی ہیں۔

فرنٹ اور حکومت کے درمیان گفتگو کے دوران اسلامی ریاست کی تعریف کو بنیادی موضوع بنایا جائے گا۔ ایم آئی ایل ایف کا زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ ہوگا کہ جزیرے کے مقامی باشندوں میں مسلم علاقوں کے علیحدہ ریاست کے قیام پر رائے شماری کرائی جائے اور 1953ء سے پہلے سے وہاں آباد عیسائیوں کو اس عمل سے خارج رکھا جائے جو پہلے ہی اکثریت میں ہیں۔ یہ ایسا مطالبہ ہے جو منیلا کو بھی منظور نہیں ہوگا تاہم سلامت ہاشم اور کمانڈر ان چیف الحاج مراد کا کہنا ہے کہ شدت پسندانہ نعرے بازی کے پیچھے دراصل بہت سی ویسی باتیں ہیں جن پر گفتگو ہونی ہے مثلاً اسلامی سرحدی شناخت کی جغرافیائی حدود اور مرکزی حکومت سے اس کا تعلق کیونکہ نام نہاد اے آر ایم ایم صحیح معنوں میں خود مختاری کی نمائندگی نہیں کرتا اس لیے ہمارا موقف یہی ہے کہ ہم آزادی سے کم کوئی اور شے قبول نہیں کریں گے تاہم ہاشم کا یہ بھی کہنا ہے کہ دوران گفتگو اگر واقعی پر کشش متبادل پیش کش ہوئی تو ممکن ہے کہ وہ اپنا ذہن بدل دیں۔ حاجی مراد نے بھی اس حقیقت پسندی کی حمایت میں ہیں اور کسی متبادل صورت حال پر غور کرنے پر تیار ہیں جس میں مورو عوام اپنے ذاتی نظام حیات و حکومت پر عمل پیرا رہ سکیں۔

شاید ایم آئی ایل ایف کے نزدیک علیحدگی سے زیادہ شرعی قانون مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا مسلم علاقہ وجود میں لایا جائے جہاں مسلمانوں کے تمام خانگی اور زیادہ متشرع فوجداری کے معاملات شرعی قوانین کی روشنی میں طے پائیں۔ ایم آئی ایل ایف اور آر لینڈو سوتار ہا تو دونوں سے روابط رکھنے والے مسلم سیاستداں ماگوٹن داناؤ جو کنداؤ کے گورنر بھی ہیں ان کا خیال ہے کہ ایم آئی ایل ایف ایک ایسے بعض ریاستوں اور شہروں پر مشتمل ایک ایسے خطے کے قیام پر رضامند ہو جائے گی جہاں مسلم قوانین نافذ ہوں گے لیکن ضروری نہیں کہ وہ خطہ فلپائن سے الگ بھی ہو۔ □

سونے سے پہلے دودھ کا گلاس ہرگز نہ پئیں

سونا جاگنے سے زیادہ احتیاط چاہتا ہے

بے خوابی جدید تہذیب کے تحائف میں سے ایک تحفہ ہے۔ بھاگ دوڑ کی زندگی، تفکرات، اعصابی دباؤ، ذہنی کھنچاؤ، پریشانیاں، مسائل، خوف، الجھن، غم و غصہ الغرض لاتعداد اسباب شمار کئے جا سکتے ہیں جو بے خوابی کا سبب بن سکتے ہیں۔ ایک بہت کامیاب تاجر کو نیند کیوں نہیں آتی؟ اس کی وجہ صرف کاروباری اتار چڑھاؤ بھی ہو سکتا ہے اور کوئی گھریلو نفسیاتی مسئلہ بھی۔ ایک طالب علم امتحان کے زمانے میں بے خوابی کا شکار ہو سکتا ہے اور ایک گھردار خاتون شوہر کی پردیس روانگی یا بچوں کی بیماری کے سبب نیند کی مٹھاس سے محروم ہو سکتی ہے۔

آیئے دیکھیں نیند کیا ہے؟

نیند قدرت کا ایک پراسرار عمل ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والی تحقیقات سے ابھی تک جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ نیند ہمارے لئے اسی قدر ضروری ہے جتنی ہوا اور غذا۔ تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ مسلسل کئی دن کئی راتیں جاگتے رہے ہیں۔ آخر کار شدید ذہنی اختلال کا شکار ہو گئے اور ان کو معمول پر آنے میں کئی دن لگے اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اگر کسی کو مسلسل طویل عرصے تک بیدار رہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اس سب کے باوجود نیند کے بارے میں بعض باتیں دلچسپی اور اہمیت کی حامل ہیں۔

آپ رات کو کتنے گھنٹے سوتے ہیں؟ ممکن ہے کہ آپ کا جواب دو تین گھنٹے ہو اور آپ کے جڑواں بہن یا بھائی کا نیند کا دورانیہ ساتھ آٹھ سے دس بارہ گھنٹے ہو۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز پہلو ہے کہ ایک ہی والدین کی جڑواں اولاد نیند کے معاملے میں بالکل ایک دوسرے کی ضد بھی ہو سکتے ہیں، مختلف بھی ہو سکتی ہیں گویا آپ کوئی فارمولا نہیں بنا سکتے۔ یہ

خود آپ کی طبیعت اور مزاج پر منحصر ہے کہ آپ کتنے گھنٹے نیند لے کر تازہ دم ہوجاتے ہیں۔

کم سونا مفید ہے یا مضر؟ اس کا انحصار بھی آپ کی نیند کے دورانئے پر ہے۔ اگر آپ ساتھ آٹھ گھنٹے سوتے ہیں لیکن کسی وجہ سے تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوپاتے تو یہ وقتی طور پر آپ کی ذہنی اور جسمانی کارکردگی کو متاثر کرے گا لیکن اگر اس کو مستقل بنالیا جائے تو پھر آپ کی صحت خطرے میں پڑسکتی ہے۔

یہاں یہ بھی امر دلچسپی کا حامل ہے کہ آپ اپنی نیند کسی وجہ سے کچھ دن پوری نہ کرسکیں تو بعد میں اس "ضائع شدہ" یا "گم شدہ" نیند کو پورا نہیں کرسکتے۔ صرف اتنا ہوگا کہ آپ ابتداء میں کچھ دن زیادہ گھنٹے سولیں گے۔

ممکن ہے آپ دفتر میں کوئی اہم کام بھول گئے ہوں جو گھر پہنچ کر یاد آرہا ہو۔ آپ کسی اور ذہنی کشمکش یا تناؤ میں بمتلا ہوں یا کوئی تنگ کرنے والی بیماری خصوصا ایسی بیماری جو سانس سے متعلق ہو جیسے نزلہ، زکام، دمہ، پھیپھڑوں کا ورم، ہوائی نالی کی تنگی یا اس کا ورم، خواہ گاہ کا غیر آرام دہ ماحول، کسی لاشعوری یا شعوری خوف کا اثر، ناپسندیدہ افراد کی موجودگی، بہت زیادہ تھکن (حالانکہ تھکن بھی نیند لانے میں معاون ہے) اپنے ساتھی، خصوصا شریک حیات سے کسی قسم کی ناراضگی، ناقص غذا کا استعمال، تیز ہیجان اور تحریک پیدا کرنے والی اشیاء جیسے چائے، کافی وغیرہ کا استعمال، جنسی ملاپ کے بعد شدید تھکن اور کمزوری، خواتین کے مخصوص ایام کی تکلیف الغرض اس سلسلے میں جو بھی بنیادی امر ہو اس کو دور کئے بغیر اچھی نیند نہیں آسکتی۔ بہت زیادہ پیٹ بھرا ہونے یا بالکل خالی پیٹ ہونے سے بھی نیند متاثر ہوتی ہے۔ بعض افراد خواب آور ادویات کا استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا استعمال معالج کے مشورے اور رہنمائی کے بغیر قطعی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ آخری تدبیر ہے۔ عام حالات میں مذکورہ بالا اسباب میں سے، جو بھی ہو اس کو دور کرنے سے بھی نیند آجاتی ہے۔ دوا کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ادویات کو اگر معمولی بے خوابی یا کم خوابی پر استعمال کرنے کی عادت ڈال لی جائے تو بعد میں جسم ان کا نشے کی طرح عادی ہوجاتا ہے۔ اچھی نیند کے لئے پہلے آپ تمام کاموں اور عبادت سے فارغ ہوجائیں۔ خواب گاہ میں موسم کی مناسبت سے بستر استعمال کریں

اچھی نیند کے لئے پہلے آپ تمام کاموں اور عبادت سے فارغ ہوجائیں خواب گاہ میں موسم کی مناسبت سے بستر استعمال کریں۔ نیم گرم پانی سے غسل کرلینا بھی ایک بہت موزو اور کارآمد طریقہ ہے۔ صاف ستھرا اور آرام دہ لباس پہن کر لیٹ جائیں۔ بستر نہ بہت نرم ہونا چاہئے نہ بالکل سخت بلکہ درمیانہ ہو۔

۔ نیم گرم پانی سے غسل کرلینا بھی ایک بہت موزوں اور کارآمد طریقہ ہے۔ صاف ستھرا اور آرام دہ لباس پہن کر لیٹ جائیں۔ بستر نہ بہت نرم ہونا چاہئے نہ بالکل سخت بلکہ درمیانہ ہو۔ بہت نرم اور بہت سخت بستر آپ کو بے آرام کردے گا۔ خواب گاہ میں روشنی کم ہو تو بہتر ہے۔ بعض لوگ اندھیرا کئے بغیر سو نہیں سکتے، بعض ہلکی نیلی یا سبز روشنی پسند کرتے ہیں۔ خواب گاہ میں تازہ ہوا کی آمد و رفت کا مناسب اہتمام کیا جائے اور سونے سے پہلے چائے، کافی قسم کی اشیاء قطعی استعمال نہ کی جائیں، یہ آپ کی نیند کو بھگادیں گی۔

ایک عام غلطی۔ اکثر لوگ سونے سے پہلے دودھ کا ایک گلاس پیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس صورت میں معدے کو دوبارہ اپنی ڈیوٹی سنبھالنا پڑتی ہے اور عضلات تن جاتے ہیں اور اس تناؤ سے نیند بھاگ جاتی ہے۔ بہرصورت یہی ہے کہ سونے سے کم سے کم تین گھنٹے پہلے کھانے کے ساتھ یا بعد دودھ استعمال کرلیا جائے۔ اس کے بعد سونے تک کچھ کھانا مناسب نہیں ماسوائے معالج کی ہدایات کے

سوتے وقت خوشگوار یادیں تازہ کرنے یا اچھی باتیں سوچنے سے نیند بہتر طور پر آتی ہے۔ اگر آپ دفتر کے مسائل پر غور کرنے لگیں گے تو نیند اڑ سکتی ہے۔

دراصل نیند کے آغاز کے ساتھ ہی آپ کے جسمانی نظام میں کئی تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں۔ دوڑ بھاگ میں آپ کے تنفس کی رفتار جو ہوتی ہے، نیند کے وقت وہ بالکل مدھم پڑجاتی ہے۔ حرکات قلب میں نمایاں کمی آجاتی ہے۔ شریانیں (ہاتھوں پیروں کی) پھیلنے لگتی ہیں اور جسم آہستگی سے نیند کی حسین وادیوں کی سمت بڑھنے لگتا ہے۔ تفکرات اور ہیجان خیز اشیاء ان سب چیزوں کو بلا ڈالتی ہے اس لئے ان سے دور رہ کر ہی پر سکون نیند حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک دلچسپ سوال ڈراونے خوابوں کے متعلق کیا جاتا ہے۔

کیا ڈراونے خوابوں کی کوئی حقیقت ہے اور ان کا اثر کیا ہوتا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈراونے خواب محض تخیل کی پیداوار بھی ہوسکتے ہیں اور لاشعور کی گرفت بھی۔ مثلا ایک طالبہ خواب میں دیکھتی ہے کہ اس کی پرنسپل انتقال کرگئی ہے۔ یہ طالبہ کا لاشعور ہے جو وہ اپنی پرنسپل کی موت کی صورت میں اس سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ ایک شخص خود کو پہاڑ سے گرتا دیکھتا ہے۔ ایک ذی مرتبہ شخص ہے یہ اس کا لاشعوری خوف ہے کہ وہ اپنا مرتبہ کسی اسکینڈل کی وجہ سے کھو بیٹھے گا۔ بعض ڈراونے خواب کسی بیماری کا رد عمل بھی ہوسکتے ہیں لیکن یہ بات واضح رہے کہ ڈراونے خواب واقعی اچھا اثر نہیں چھوڑتے خاص کر کمزور اعصاب کے لوگوں پر۔ ایسے ڈراونے خواب عموماً جسمانی یا نفسیاتی یا دونوں عوارض میں بمتلا افراد کو نظر آتے ہیں جب کہ تندرست اور خوش طبع اور مثبت فکر رکھنے والوں کو ایسے خواب بالعموم دکھائی نہیں دیتے اور ان کی نیند گہری، خوشگوار اور پر سکون ہوتی ہے۔ ▭

ایک ذرا سی کوشش مخاطب کو آپ کا اسیر بنا سکتی ہے

شخصی ارتقا کے چند اہم راز

"وقفہ صحت کے لئے بہت ضروری ہے" ان گنت مواقع پر آپ نے یہ جملہ پڑھا یا سنا ہوگا۔ مختلف لوگ مختلف حوالوں سے اس جملے کا استعمال کرتے ہیں۔ علم نفسیات کی رو سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ "وقفہ نہ صرف صحت کے لئے بلکہ متوازن و مضبوط شخصیت کے مناسب اظہار کے لئے بھی ضروری ہے۔"

آپ نے بڑے بڑے سیاستدانوں کو تقریر کرتے دیکھا یا سنا ہوگا۔ اپنے اپنے ہنر و میدان میں یکتا دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اداکاروں کے انٹرویوز دیکھے یا سنے ہوں گے۔ یہ سب لوگ اپنی گفتگو، اپنے رویوں اور اپنی حرکات میں چند لمحوں کے وقفے ضرور دیتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ ان کو پتہ ہوتا ہے کہ کامیاب لوگوں کی شخصیت کا ایک اہم جزیہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ اور دلچسپی اپنی جانب مبذول کرانے کے لئے کسی بات کو شروع کرنے سے پہلے یا بات چیت کے دوران لمحاتی، ضروری اور بامقصد وقفہ ضرور دیتے ہیں۔ چند سیکنڈ کی خاموشی گفتگو کو معنویت بخشتی ہے۔ خاموشی سے مراد یہ نہیں کہ آپ بلاوجہ چپ سادھ کر بیٹھ جائیں یا آپ کی خاموشی سے یہ تاثر جھلکے کہ آپ عدم تحفظ، جلد بازی یا اندرونی اضطراب و کشمکش کا شکار ہیں۔ چند سیکنڈ کے بامقصد وقفے سے آپ مخاطب یا سامعین کو یہ تاثر دے رہے ہوتے ہیں کہ آپ کے پاس ان کے لئے وقت ہے۔ آپ اعتماد کی دولت سے مالامال ہیں اور اپنے کام اور اپنی بات سے کلی واقفیت رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔

خاموشی اور سکوت کے لمحاتی وقفے آپ کی موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں اور مخاطب آپ کی بات کو زیادہ توجہ سے سنتا ہے اور آپ کی اہلیت پر یقین کرنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی موقع مل جاتا ہے کہ آپ اپنے خیالات کو مجتمع کرکے زیادہ یکسوئی کے ساتھ اپنی بات کو جاری کرسکیں اور یا گہری سانسیں لے کر خود کو آرام دہ حالت میں لاسکیں۔ نیز اس لمحاتی وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ مخاطب کی بات کا بھی جائزہ لے سکتے ہیں اور اس کے مطابق اپنے لائحہ عمل اور گفتگو میں بھی تبدیلی کرسکتے ہیں۔ خود کو وقت دینا سیکھئے، گفتگو کے دوران چند لمحوں کا وقفہ ہی وہ وقت ہے جو آپ خود کو دے رہے ہوتے ہیں۔ آپ اس طرح لوگوں کی نگاہ میں بھی خود کو ان لوگوں کی بہ نسبت ممتاز بنا رہے ہوتے ہیں جو رکے بغیر بولے چلے جارہے ہوتے ہیں اور ان کی باتیں ہوا میں تحلیل ہورہی ہوتی ہیں۔

زندگی کے ہر معاملے کی طرح گفتگو اور خاموشی کے درمیان توازن قائم رکھیں۔ آپ یقینا مخاطب کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

اپنی بات ہوا کی نذر نہ کریں۔ اپنی شخصیت کو سامنے والے کی نگاہ میں ممتاز بنائیے۔ جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ٹھہر ٹھہر کر بات کریں لیکن اتنا بھی نہیں کہ آپ کسی اور سیارے کی مخلوق لگیں۔ اپنے کام اور بات چیت میں ضروری اور لمحاتی وقفے دینے کی عادت اپنا کر آپ اپنی یادداشت کو بھی بہتر بنا رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو اتنا وقت مل جاتا ہے کہ آپ سامنے والے شخص کا نام یا اس کی کسی بات یا حوالے کو ذہن میں لاسکیں اور پھر اس کی روشنی میں اپنی بات کہہ سکیں۔

اپنے رویے اور شخصیت کو ٹھہراؤ اور بردباری سے ممیز کرنے اور اپنی بات چیت کو معنویت اور اہمیت دینے کے لئے آپ کو مشق کی ضرورت پڑے گی اور اس مشق میں انسانی نفسیات اور رویوں کا علم آپ کی مدد کرے گا۔ کسی بھی شخص کے ساتھ جذباتی اور ذہنی رشتے کو مضبوط بنانے کے لئے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں بھی اپنائیت کے احساس کی موجودگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ ملاقات کے دوران مناسب گرم جوشی کا اظہار اور ملاقات کے آغاز اور اختتام پر مصافحے اور معانقے کا سہارا لینا اپنائیت کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ مصافحہ اور معانقہ جہاں ایک طرف گرم جوشی اور اپنائیت کو ظاہر کررہا ہوتا ہے وہاں دوسری طرف آپ کو ضروری وقفہ بھی فراہم کررہا ہوتا ہے۔ ملاقات کے آغاز میں کیا جانے والا مصافحہ اور معانقہ آپ کی یادداشت کھولتا ہے۔ مخاطب کے ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کے انداز سے آپ اس کی شخصیت اور نفسیات کے بارے میں اندازہ لگاسکتے ہیں۔

ہاتھ اور گلے لگاکر آپ اپنی سوچ اور شخصیت کی حرارت، توانائی اور جذبہ اس تک پہنچا سکتے ہیں غرضیکہ اس لمحاتی وقفے کے دوران آپ رواداری اور محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ نفسیات کے بنیادی اصولوں کی مدد لے کر مخاطب سے اپنے تعلق کو مزید مضبوط بناسکتے ہیں اور اس کی بنیاد پر اپنے مستقبل اور کامیابی کی راہ ہموار کرسکتے ہیں۔

لیکن یہ یاد رہے کہ مخاطب بھی اس موقع سے فائدہ اٹھارہا ہوگا۔ ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کے عمل کو نہ اتنا سرسری اور سطحی رکھیں کہ مخاطب کے ہاتھ کی ہڈیاں اور پسلیاں چیخ اٹھیں اور نہ ہی اتنی دیر تک مخاطب کا ہاتھ تھامے رہیں اور اسے گلے لگاکر کھڑے رہیں کہ وہ گھبرا جائے۔ مناسب وقت، مناسب طاقت اور مناسب گرمجوشی ہی مخاطب کے ذہن پر آپ کی شخصیت کا مناسب تاثر قائم کرسکے گی اور یہ چیز مشق سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ مصافحے اور معانقے کے وقت درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

مناسب فاصلے کے ساتھ مخاطب سے ہاتھ ملائیں یا اسے گلے لگائیں۔

انتظار نہ کریں۔ پہل آپ کریں اور ہاتھ بڑھائیں۔

محض انگلیوں سے مخاطب کی ہتھیلی کو چھونے سے کام نہیں چلے گا۔ مخاطب کی ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی کی گرفت میں لیں۔ تھوڑا سا دباؤ ڈالیں اور مروجہ طریقے کی بجائے ذرا زیادہ دیر تک ہاتھ تھامے رکھیں۔

زیادہ گرمجوشی اور اپنائیت کا اظہار کرنا ہے تو دوسرے ہاتھ سے مخاطب کی ہتھیلی کی پشت بھی گرفت میں لیں لیکن یہ خیال رہے کہ آپ کو اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کرنا ہے۔

مصافحے کے ساتھ ساتھ حال احوال بھی پوچھتے رہیں۔

مصافحے کے بعد تیزی سے ہاتھ نہ چھڑائیں بلکہ کچھ وقفہ دیں۔

اسی طرح گلے ملتے وقت بھی خیال رکھیں کہ اپ اپنا جسم مخاطب کے جسم کے ساتھ رگڑیں نہیں اور نہ ہی اسے بھینچنے کی کوشش کریں اور نہ ہی اپنے بدن کا سارا زور مخاطب کے اوپر ڈال کر کھڑے ہوجائیں اور نہ ہی معانقے کو اتنا طول دیں کہ سامنے والا بیزار ہوجائے۔

آپ کا گلے ملنے کا انداز ہمت بندھانے، خیال رکھنے اور اعتماد کرنے کی عکاسی کرے تو آپ مخاطب کے ساتھ زیادہ مستحکم تعلقات استوار کرسکتے ہیں لیکن یہ خیال رہے کہ بعض لوگ دیگر لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو آپ ہر بار زیادہ دیر تک گلے لگاکر کھڑا رہیں گے تو وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن اندرونی طور پر وہ آپ سے کھنچتے چلے جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ وہ آپ سے ملتے ہوئے کترانے لگے۔

مصافحے اور معانقے کے وقت آپ کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ ضرور ہونی چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ آپ محض رسماً کسی سے ہاتھ ملا رہے ہیں اور آپ کا چہرہ اور انداز چغلی کھارہا ہو کہ آپ اس سے مجبوراً مل رہے ہیں۔ دشمن سے بھی کھلے دل کے ساتھ ملیں۔ ایسا ہونا کچھ انوکھی بات نہیں کہ آج کا دشمن کل کا دوست ثابت ہو۔

کبھی بھی پیچھے سے اچانک ہاتھ ڈال کر کسی کو گلے لگانے کی کوشش نہ کریں۔ سو میں سے ننانوے لوگ یہ انداز پسند نہیں کرتے۔ آپ خواہ کسی سے کتنے ہی بے تکلف کیوں نہ ہوں، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے یا اسے گلے لگانے سے پہلے اسے اپنا چہرہ ضرور دکھائیں۔

مصافحے اور معانقے کے وقت آپ کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ ضرور ہونی چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ آپ محض رسماً کسی سے ہاتھ ملا رہے ہیں اور آپ کا چہرہ اور انداز چغلی کھارہا ہو کہ آپ اس سے مجبوراً مل رہے ہیں۔ دشمن سے بھی کھلے دل کے ساتھ ملیں۔ ایسا ہونا کچھ انوکھی بات نہیں کہ آج کا دشمن کل کا دوست ثابت ہو۔

آپ جس طرح اپنے بچوں کے ساتھ محبت اور شفقت کا مظاہرہ کرتے ہیں، انہیں گود میں لے کر پیار کرتے ہیں، تھپکیاں دیتے ہیں، سر سہلاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں دباتے ہیں یعنی اپنے جسمانی لمس کے ذریعے اپنی محبت کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں اسی طرح یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہر بالغ شخص کے اندر بھی ایک بچہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور وہ بچہ اسی وقت آپ سے مانوس ہوگا جب آپ اپنے جسمانی لمس کی مدد سے اسے اپنائیت کا احساس دلائیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم تہذیب و معاشرے کے مروجہ اصولوں کو اس حد تک اپنی زندگی میں داخل کرلیتے ہیں کہ پھر فطرت و نفسیات کے بنیادی اصول ہمارے ذہن سے محو ہوجاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ جوں جوں آپ کا بچہ بڑا ہوتا ہے اس کے ساتھ آپ کے جسمانی لمس کا تعلق کم ہوتا چلا جاتا ہے اور جونہی وہ عہد بلوغت میں قدم رکھتا ہے، آپ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بس اب اس کے سر کو سہلانے، پیٹھ کو تھپکنے اور گلے لگانے کا سلسلہ ختم۔ بچہ بڑا ہوگیا ہے، بچے جسمانی اور ذہنی طور پر بڑے ضرور ہوجاتے ہیں لیکن جذباتی سطح پر ہر شخص کے اندر ایک معصوم بچہ تمام عمر زندہ رہتا ہے۔ اسے وقتاً فوقتاً تسلی و تشفی کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ تسلی و تشفی ہمارے اور آپ کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا اور اس کے لئے اکثر اوقات زبانی محبت کا اظہار کافی نہیں ہوتا، جسمانی لمس کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ دوران ملاقات موقع محل کی مناسبت سے مخاطب کے کندھے یا ہاتھ پر ہاتھ رکھئے، اس کی پیٹھ تھپکئے، سر کو چھوئیے لیکن بہت

ہی محتاط ہو کر اور وہ بھی کبھی کبھی۔ خصوصاً ان مواقع پر جب آپ کسی کو مبارکباد دے رہے ہوں یا اس کی تعریف کر رہے ہوں یا اسے کوئی نصیحت کر رہے ہوں یا اسے کچھ سمجھا رہے ہوں یا اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہے ہوں یا اس کی ہمت بڑھا رہے ہوں یا کسی خاص بات کی جانب اس کی توجہ مبذول کرا رہے ہوں یا اسے کسی نئے کام کے حوالے سے تیار کر رہے ہوں یا اس کی کسی بات پر خوشی و مسرت کا اظہار کر رہے ہوں یا اسے اطمینان دلا رہے ہوں۔ ایسے مواقع پر جسمانی لمس کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے اور عموماً مخاطب برا بھی نہیں مانتا۔ اس طرح آپ سامنے والے شخص کے اندر چھپے ہوئے بچے کو اپنے آپ سے قریب کر سکتے ہیں اور بچہ جب کبھی کسی کے ساتھ جذباتی وابستگی پیدا کر لیتا ہے تو بہت کم اور وہ بھی مخصوص حالات میں وہ وابستگی ختم ہو پاتی ہے۔

حجاب اور حیا کا اسلامی تصور

دراصل عورت اور مرد دونوں کا محافظ

ترقی کی دوڑ، زمانے کی ہوا اور جدیدیت کے گھڑے ہوئے تصورات نے اگر اہل اسلام کے ایک حلقے کی نظر میں حجاب اور حیاء کے اسلامی تصور کو فرسودہ بنا دیا ہے تو وہیں اس کے برعکس ایسے بھی واقعات سامنے آئے ہیں کہ اس تصور نے ایسے ذہنوں اور دلوں پر دستک دے کر اپنی اہمیت تسلیم کروائی ہے جو ابھی کل تک شاید اسلام کا نام لینا گوارہ نہ کرتے تھے۔ کچھ یہی حال امریکہ کے ایک صوبے میں ریشم کے کارخانے میں جانفشانی سے کام کرنے والے مسٹر گریرانگلے اور ان کی بیوی کا تھا۔ وہ دونوں اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے لیے بہتر سامان فراہم کرنے کے متمنی تھے۔ 1950ء میں ان کے یہاں ایک بیٹی کا تولد ہوا جو آگے چل کر الزبیتھ برانگلے کے نام سے مشہور ہوئی۔ جیسا کہ تمام والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ زندگی میں جن محرومیوں کا سامنا انھیں کرنا پڑا ان کی اولاد بھی ان کا شکار نہ ہو۔ برانگلے نے الزبیتھ کو پال پوس کر اس قابل بنایا کہ وہ بہتر تعلیم حاصل کر سکے یہاں تک کہ اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی، اس نے تعلیمی مراحل کامیابی سے طے کیے اور اسے ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر کالج سے نکلنا تھا۔ ڈاکٹر تو وہ ضرور بنی لیکن اس کے ساتھ اس کی زندگی میں انقلاب بھی آیا۔ گویا اگر اس کے والدین کے دل میں اسے ڈاکٹر بنانے کی خواہش نہ پیدا ہوئی ہوتی تو یہ انقلاب بھی واقع نہ ہوتا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ایک ذہین اور سنجیدہ طالبہ کی حیثیت سے مسائل حیات پر گہرائی سے غور و فکر کی عادت الزبتھ میں پڑ چکی تھی۔ اپنے مطالعہ اور انسانی جسم کی تشریح کے دوران جب وہ اس کی تشکیل کے مراحل اور موجودہ شکل و صورت پر غور کرتی تو جیسے مبہوت ہو کر رہ جاتی اور یہ سوچتی کہ جو سائنسی تعبیرات اس ضمن میں پیش کی جاتی رہی ہیں ان سب سے پرے کوئی ماورائی حقیقت ہے جس تک رسائی کے لیے وہ بے قرار ہے۔ انسان کے ارتقاء کے مختلف نظریات اور اس سلسلے میں اسلامی موقف کا اس نے مطالعہ کیا تو اسے ایسا لگا کہ ایک نئی حقیقت اس پر روشن ہو رہی ہے۔ اب ایلزبتھ کی دلچسپی اور بڑھی اور ان کا شعور بھی پختہ ہو چلا تھا لہٰذا انھوں نے بعض احباب کی مدد سے اسلام اور دیگر ادیان سماویہ کا تقابلی مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان سب میں اسلام انسانی عقل سے قریب تر ہے۔ اب اسلامی تعلیمات کے مطالعے میں انھیں ایک خاص طرح کا سکون و اطمینان حاصل ہونے لگا۔

ڈاکٹر ایلزبتھ برانگلے یہ اعتراف کرتی ہیں کہ اسلام کے مطالعے نے انھیں باور کرایا کہ کوئی ایسا مالک کل ہے جس نے ارض و سما کی تخلیق کی اور کوئی دوسرا اس پر قادر نہیں تھا اور اس کا مقصد یہی ہے کہ انسان اس کی قدرت پر متحیر ہو کر وحدانیت کا تعین کرے اور شرک سے بچے۔ یعنی کہ وہ اس کا اعتراف کرے کہ یہ سب اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے اور جب وہ کائنات تخلیق کر سکتا ہے تو اس وجود کی بھی تخلیق اللہ کے لیے مشکل کیوں ہوتی جو اس کائنات کو آباد رکھے۔ اس طور پر اگر انسان خود اپنے قد و قامت پر نظر ڈالے تو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگے گی کہ اس کی تخلیق اعجاز الٰہی ہے

ڈاکٹر ایلزبتھ مزید کہتی ہیں کہ اسلام نے ان پر تخلیق انسان کا راز منکشف کر دیا اور انھیں یقین آگیا کہ انسانی عقل چاہے جس معراج کو بھی پہنچ جائے، عبقریت

دانشوری اور علمیت جس مقام کو بھی چھولیں نفس، روح اور جسم انسانی کی تشکیل جیسے امور اپنی جگہ پر راز ہی رہیں گے اور ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو بھی نہ ہوسکے گا۔ ایلز بتھ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں۔ انسانی جسم کی تشکیل پر غور و خوض نے اللہ کی وحدانیت اور عدم شرکت تک پہنچنے کی راہ ان کے سامنے کھول دی اور انھیں یہ بتایا کہ اللہ کو پوری انسانیت کی سلامتی اور فلاح مقصود ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے آخری پیغام کی صورت میں اسلام نازل کیا جسے بڑے بڑے پیغمبروں اور مقرب بندوں نے قبول کیا اور انسانوں کے درمیان پھیلایا۔ یہی وہ ذہن ہے جو ذہنوں کو دن اور رات کے خالق کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے

ایلز بتھ کے نزدیک غور و فکر انسان کے لیے عظیم نعمت ہے اور یہ غور و فکر ان لوگوں کا وصف خاص ہے جو حقیقت کے متلاشی رہتے ہیں۔ اس کی مثال وہ رسول اللہ کی شخصیت سے دیتی ہیں کہ آپ پہروں غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے اور دن اور رات کی تخلیق، کائنات کے آغاز اور اس کے اور موجود اشیاء و مظاہر پر غور و فکر فرماتے تھے اور اسی صفت نے آپ کو وہ مقام بخشا کہ اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کا پیغام ان کے درمیان لے جانے کے لیے آپ کا انتخاب کیا جائے۔ ایلز بتھ نے وحی کے پہلے لفظ اقرا کے نزول سے اسلام کا پیغام انسانوں تک پہنچالینے کے بعد رسول اکرم کی وفات تک کے واقعات کے مطالعے کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا ہے۔ آپ کی ذات اقدس ساری دنیا کے لیے منارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی ہیں کلمہ شہادت پڑھ کر صف اسلام میں شامل ہونے کے ساتھ ہی انھوں نے اسلامی پردہ اختیار کرلیا جو عورت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ مرد کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ انھوں نے ایک با اخلاق دین دار مسلمان سے شادی کی ہے جن سے انھوں نے قرآن پڑھا اور عربی زبان سیکھی تاکہ عبادات کی پابندی ہوسکے اور یہ ان کی بڑی آرزو تھی۔ اس دوران انھوں نے فریضہ حج کی ادائیگی بھی کی ہے اور آب زمزم پیتے ہوئے قرآن حفظ کرلینے اور سمجھ کر پڑھنے کی اہلیت کے حصول کی دعا کی۔ اس نعمت پر شکر ادا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کہ اللہ نے انھیں حافظ بنادیا اور تلاوت قرآن پر دوام بخشا ہے کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ قرآن کے اصولوں پر جو عمل پیرا رہتا ہے دور حاضر کی مادی خرافات اس کے امن و سکون کو منتشر نہیں کرسکتیں۔ ▭

کیا پیدائش سے پہلے بچے کا جنس معلوم کرنا درست ہے

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال سائنس نے اس صدی کے نصف آخر میں تیز رفتار ترقی کی ہے۔ دیگر شعبوں میں بے پناہ ترقیوں کے ساتھ طب کے میدان میں ایک حیرت انگیز کامیابی یہ بتائی جاتی ہے کہ اب رحم مادر کے اندر پلتے ہوئے جنین کی جنس کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ عمل ہمارے اس عقیدے کے منافی نہیں ہے کہ ارحام میں کیا ہے، اس کا علم صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ کو ہے۔ اور کیا ایسا کرنا علم غیب میں مداخلت نہیں ہے؟

جواب۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ان اللہ عندہ علم الساعہ، وینزل الغیث، ویعلم مافی الارحام وماتدری نفس ماذا تکسب غدا وماتدری نفس بای ارض تموت۔

اس آیت کریمہ میں پانچ ایسے امور غیبی کا ذکر ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ نہ ملائک کو اور نہ جن و بشر کو۔ جہاں تک سوال ہے اس بات کا کہ سائنس کی ترقیات کے نتیجے میں جنین کی جنس کا تعین ممکن ہوگیا ہے تو اس سلسلے میں شاید ہماری نظر ان شرائط اور حالات پر سے ہٹ جاتی ہے جو تعین جنس جنین کی جانچ کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ جانچ استقرار حمل کی ایک خاص مدت گزر جانے کے

ہی ممکن ہے اور اس دوران مغیبات خمسہ کا فیصلہ اللہ کی جانب سے ہوجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ رحم مادر میں جو جنین ہے وہ نر ہے یا مادہ، صلح ہے یا بدبخت، اس کا رزق کشادہ ہے یا تنگ، اس کی موت کب واقع ہوگی اور کس زمین پر واقع ہوگی۔ سائنس کا بنیادی سروکار چونکہ براہ راست محسوس کیے جانے والے اور نظر آنے والے مظاہر سے ہے اس لیے وہ جنین کی ابتدائی شکل و صورت اختیار کرنے کے مرحلے سے ہی اپنا عمل شروع کرتی ہے اور اس سے پہلے کی کیفیات سے اسے کوئی غرض نہیں اور یہ وہ مرحلہ ہے جس کے متعلقات کا واقعی کسی کو علم نہیں۔ ان کا علم غیب میں تھا اور آج بھی ہے۔ جب آپ کسی ماہر طبیب کے پاس اس غرض سے کسی خاتون کو لے جائیں گے تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ان کے یہاں جس بچے کی ولادت ہونے والی ہے وہ بیٹا ہے یا بیٹی ہے اور آپ کو

یقین دلانے کے لیے ہم جانچ کرکے بھی دکھادیتے ہیں۔

سوال۔ہمارے جاننے والے ایک صاحب ہیں۔قریبی بازار میں ان کی دوکان ہے۔ان کے یہاں کچھ ایسا انتظام ہے کہ آپ چاہیں تو کوئی سامان نقد ادائیگی کرکے لینے کے علاوہ اس کی معینہ ماہانہ قسطوں پر بھی خرید سکتے ہیں۔دوسری صورت میں اسی سامان کی مجموعی قیمت نقد اداکردہ قیمت کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہوجاتی ہے۔میں نے بھی کئی بار سوچا کہ یکمشت ادائیگی کی گنجائش رہتی نہیں ہے اور بعض اشیاء کی ضرورت شدید ہے لیکن اس خیال سے اس پر عمل نہ کرسکا کہ پتہ نہیں یہ طریقہ جائز ہے بھی یا نہیں۔براہ کرم مشورہ دیں کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب۔فرض کیجئے کہ آپ نے ایک ہزار روپے کی دو کرسیاں اس دوکاندار سے خریدیں اور خریدتے وقت سو روپے ادا کردئے۔کرسیاں آپ اپنے گھر لے آئے۔اب وہ آپ کی ملکیت ہیں۔اس کے بعد آپ سو سو روپے کی دس قسطوں میں کرسیوں کی قیمت چکادیں گے تو وہ مجموعی طور پر آپ کو گیارہ سو میں پڑیں گی۔اس طرح اگر آپ کو وہی دو کرسیاں ایک ہزار میں نقد بیچنے کے بعد اپنے دوسرے گاہک کو گیارہ سو کا دام بتائے اور گاہک وہ قیمت ادا کرنے پر راضی ہوجائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔یہ بیع درست سمجھی جائے گی اور اول الذکر بیع بھی درست سمجھی جائے گی یعنی کہ کسی شی کو موٴجل قیمت کو اس کی معجل قیمت کے مقابلے میں زیادہ مقرر کرنے میں حرج نہیں۔

سوال۔وہ شخص جسے ماہ رمضان کے دوران سفر درپیش ہو اس کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے یا عام دنوں کی طرح کھانا پینا،خصوصاً اس بنا پر کہ فی زمانہ وسائل سفر میں بہت ترقی ہوچکی ہے۔اب پیدل اور اونٹ گھوڑے سے سفر کا رواج تو ہے نہیں۔ریل،موٹر کار،ہوائی اور بحری جہازوں کا زمانہ ہے۔

جواب۔مسافر کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ سفر میں روزہ نہ رکھے لیکن اگر رکھ لے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے،تاہم اس پر اصرار نہیں کیا جاسکتا۔بعض حضرات کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ سلسلے وار روزہ رکھنے میں ایک عادت سی بن جاتی ہے اور اس کی وجہ سے روزے پورے ہوجاتے ہیں،بعد میں قضا رکھنے میں تسلسل ختم ہوجانے کی بناء پر پریشانی ہوتی ہے۔یہ ایک ایسا عذر ہے جس میں سہل پسندی کے علاوہ اور کسی خیال کو دخل نہیں۔سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھنا اور رکھنا دونوں رسول اللہ سے ثابت ہیں مگر گرمی اور صعوبت کے بڑھنے کا اگر خوف ہو تو روزہ توڑا جاسکتا ہے۔ایک بار رسول اللہ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص جو روزے کی حالت میں تھا،گرمی کی شدت کی وجہ سے راستہ بھول گیا تو آپ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا اچھا نہیں ہے۔اللہ کو یہ پسند ہے کہ اس کے بندے اس کی دی گئی آسانیوں سے فائدہ اٹھائیں اور اسے ناپسند ہے کہ اس کے بندے ان آسانیوں سے خود کو محروم کرکے گناہ میں مبتلا ہوں۔بالفاظ دیگر اللہ تعالی اپنے بندوں کی طرف اپنے فیصلوں پر عمل درآمد ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔اس اعتبار سے لوگ کہیں کا سفر کریں چاہے پیدل یا اونٹ،گھوڑے،کار یا ہوائی جہاز سے ان کی حیثیت ہوگی مسافر کی ہی اور ان پر مذکورہ رخصت کا یکساں طور پر اطلاق ہوگا۔اللہ تعالی نے رسول کے زمانے میں سفر اور اقامت کے جو ضابطے وضع فرمادئے تھے وہ صرف اس زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہر زمانے کے لیے تھے اور اس میں جو بات ملحوظ تھی وہ تھی انسان کے اپنے مستقر چھوڑنے کے بعد سے اس کی معمولات میں واقع ہونے والی تبدیلیوں اور صعوبتوں کا جن کا امکان ہر صورت میں موجود رہتا ہے۔ □

بقیہ: مغرب میں اسلام کا مطلب ہے تشدد

کررہی ہے۔اس سلسلہ میں مسلمان دوسرے اقلیتوں کے عمل سے بھی کچھ نہ سیکھ سکے کہ ٹیلی ویژن اور متنوع ذرائع ابلاغ کا وسیع پیمانے پر استعمال کرکے امریکیوں کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرتے،اس کے برخلاف امریکہ کے یہودی حالانکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد کم ہے،لیکن وہ ہر نئی تبدیلی سے بڑی قوت،فعالیت اور سرگرمی سے یہودیت اور اسرائیل کے بارے میں فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟میرا جواب یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کے ساتھ ہی حق کی آواز بلند کرنے کی کوشش بھی بہت ضروری ہے۔ہم میں سے ہر ایک کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہم جن حالات میں جو کام کرتے ہیں،اپنے کاندھے پر اس ذمہ داری کو اٹھائیں نیز ہر جگہ کے مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام سماج سے زیادہ سے زیادہ جوڑلیں کیونکہ یہ عمل اسلام کی عقلی اور وجدانی تصویر صحیح کرنے میں معاون ہوگا،خصوصاً ان اقدار میں جو اسلام عیسائیت اور یہودیت کے درمیان مشترک ہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے ایک دستاویز تیار کی تھی جس کے سلسلہ میں مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے سلسلہ میں رائج غلط عقلی اور وجدانی تصورات کو ختم کرنے اور اسلام کے تئیں ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔امریکی مسلمانوں کے ذریعہ اس کو استعمال کرنے کے لیے اس کی تیاری عمل میں آئی ہے۔اسلام کے سلسلہ میں غلط فہمیوں اور ان کے ازالہ کے تعلق سے ملیشیا میں منعقدہ ایک ورکشاپ میں شرکت سے مجھے اسی کام کے لیے خاصا حوصلہ ملا،اس کا متن میں نے دنیا بھر کے مسلمانوں سے مشورہ سے تیار کیا۔اس سلسلہ میں مجھے اپنے مذہبی استاذ اور ان کے خیالات سے بھی کافی فائدہ ہوا جنہوں نے اختلافات کے بجائے مشترک اقدار پر کافی زور دیا ہے۔مجھے اس بات پر شرح صدر حاصل ہے کہ دنیا میں امن وسلامتی مذاہب کی باہمی مفاہمت کے بغیر ممکن نہیں۔ □

مجھے اپنے شوہر سے جھجک آتی ہے

سوال میں پچیس سال کی لڑکی ہوں۔ مجھے اپنے شوہر کے سامنے گھبراہٹ اور جھجک آتی ہے۔ پہلے مجھے اپنے والد کے سامنے آنے میں بھی اسی طرح شرم آتی تھی۔ اس کی وجہ سے میری زندگی میں بہت سی مشکلیں آئیں۔ بارہا میں نے کوشش کی کہ اس کمزوری پر قابو پالوں لیکن افسوس کہ کامیابی نہ مل سکی۔ سمجھ نہیں پارہی ہوں کہ اس پریشانی کو کیسے حل کروں۔

مہ جبین، فروخ آباد

جواب شرم و حیا سے گھبراہٹ پیدا ہونا ایک ایسی صفت ہے جو عورتوں میں ہونی چاہیے اور اس صفت کی حامل عورتوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس تیز طرار اور بے باک عورتوں کو لوگ اتنا پسند نہیں کرتے اور شادی کے معاملے میں تو خاص طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی میں شرم و حیا ہو اور یہ مشرقی معاشروں کی بہت بڑی سماجی قدر ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اگر یہ شرم و حیا حد سے زیادہ بڑھ جائے تو اس سے مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں یہاں تک لڑکی یا عورت کو زندگی میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں دشواری پیش آنے لگتی ہے۔ اس کی مثال آپ ہی ہیں کہ گھبراہٹ کا یہ عارضہ آپ کو مستقل لگ گیا ہے۔ ایک بات واضح طور پر کہنی ہے وہ یہ کہ اگر آپ کو شوہر کے پاس اٹھنے بیٹھنے اور اس کے ساتھ اختلاط کے تصور و خیال سے گھبراہٹ ہوتی تو مسئلہ زیادہ سنگین سمجھا جاتا لیکن اس میں شرم کا عنصر بھی بڑی حد تک داخل ہے اس لیے ہمیں پوری توقع ہے کہ اس مشکل کو کچھ عرصے میں دور کیا جاسکتا ہے۔ یہ شرم اس بات کا اشارہ ہے کہ جو نسوانی جذبات و احساسات ایک لڑکی اور عورت میں ہونے چاہئیں وہ آپ میں پوری طرح موجود ہیں۔ اب رہ گئی ان کے اظہار یا اس کی طرف رغبت دلانے پر گھبراہٹ طاری ہونے کی بات تو اس کی اصل وجہ ہمارے معاشرے میں یہ ہوتی ہے کہ شادی کے مرحلے تک پہنچنے تک بھی لڑکیوں سے کوئی اس موضوع پر تبادلہ خیال کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ جہاں اس طرح کے راستے گھر کے بزرگ نکال لیتے ہیں وہاں پریشانی نسبتاً بہت کم پیش آتی ہے۔ عموماً گھر میں اس طرح کے رموز لڑکیوں کو مناسب پیرائے میں ان کے اندر جسمانی تبدیلیوں کے نمودار ہونے کے وقت سے بتائے جانے لگتے ہیں۔ مختصر خاندانوں میں شاید اس کا موقع مل نہ پاتا ہو اور یہ سمجھ لیا جاتا ہو کہ وقت آنے پر سب کچھ سمجھ میں آجائے گا اور سمجھ میں آجاتا بھی ہے لیکن مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں اور اس کی ایک مثال آپ خود ہیں۔

اب ہماری سمجھ سے اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے شوہر سے اپنے فیملی بیک گراونڈ پر گفتگو کریں۔ انھیں بتائیں کہ کس طرح آپ کو مردوں کے سامنے شدید گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اپنے والد کے سامنے آپ کھڑی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ آپ کی اس کمزوری سے کسی غلط فہمی میں وہ مبتلا ہوئے بغیر وہ آپ کے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں اور آپ میں مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کے دوران یہ جھجک آہستہ آہستہ دفع ہوگی۔ اور چونکہ انھیں یہ معلوم ہوچکا ہوگا کہ یہ آپ کی یہ کیفیت آپ کے ارادے اور قدرت سے باہر ہے اس لیے وہ صبر سے کام لیں گے بلکہ آپ کی حالت پر انھیں ہمدردی بھی آپ سے پیدا ہوگی۔

آپ یہ بھی کرسکتی ہیں کہ آپ کی وہ ہم عمر لڑکیاں جن کی شادی ہوچکی ہے ان سے ازدواجی زندگی کے تجربات پر نجی گفتگو کریں۔ ان کے تاثرات معلوم کریں۔ اپنے محسوسات ان کو بتائیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی آپ کے ذہن کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں بعض طفلانہ تصورات ابھی جاگزیں ہوں یعنی یہ کہ کہیں سے آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہو کہ ایک عمل جو فطری تقاضا ہے اور جس سے عموماً لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ باعث خیر ہے، اس سے آپ کو ضرر کا اندیشہ ہے یا وہ آپ کے لیے مہلک ہے۔

ایک بات اور بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ آپ جیسی لڑکیاں ہی اس اندیشے میں مبتلا رہتی ہیں بلکہ بعض مردوں میں بھی اس طرح کی جھجک ابتدائی مراحل میں پریشان کرتی ہے لیکن احباب اور قریبی رشتہ داروں سے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت اور آئندہ زندگی میں اس کی اہمیت اور مضرت کو سمجھ پیدا کرلینے اس پر قابو پالیا جاتا ہے۔

سوال میری عمر 23 سال ہے۔ میرے گھر والوں نے زبردستی مجھے ایک ایسے شخص کے ساتھ بیاہ دیا جو عمر میں مجھ سے بیس سال بڑا ہے اور صرف یہ دیکھا کہ اس کے پاس کافی مال و دولت ہے۔ انھوں نے طرح طرح سے اس کے ساتھ شادی کرلینے پر آمادہ کیا یہاں تک کہ شادی ہوگئی۔ میں اس کے ساتھ رہنے لگی اور اس کی خدمت بھی کرتی ہوں لیکن کچھ ماہ گزرنے کے بعد وہ مجھے طعنہ دینے لگا کہ میرے گھر والوں نے بڑی رقم لے کر اس کے ہاتھ مجھے بیچ دیا ہے اور اس بات کا علم مجھے نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ مجھ پر حکم چلاتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے یہ طعنہ دیتا ہے۔ اس سے میں نفسیاتی مریض ہوگئی ہوں اور جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ میرے گھر والوں نے مال و دولت کے عوض مجھے فروخت کردیا، میری بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کہ میرے والد نے یہ کیسے گوارا کرلیا۔ مجھے اپنے گھر والوں سے، شوہر سے اور یہاں تک کہ خود سے نفرت ہوگئی۔

شیریں، بنارس

جواب اگر آپ کی شادی شخص مذکور سے آپ کی مرضی سے ہوئی ہوتی تو شاید صورت حال دوسری ہوتی۔ آپ کی مشکل یہ ہے کہ شادی آپ کی مرضی کے خلاف گھر والوں نے زبردستی کردی اور اسی لیے آپ کے دل میں بیزاری اور کراہیت پیدا ہوئی کیونکہ ایسی حالت میں آپ خود کو ازدواجی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے قابل نہیں پارہی ہیں۔ ایسے میں گھر والوں کی طرف نفرت کا احساس پیدا ہونا قدرتی بات ہے کیونکہ نہ انھوں نے آپ پر جبر کیا ہوتا اور نہ یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا۔ گھر والوں کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کردینے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آپ اپنی جگہ اس قدر مختار نہیں ہیں کہ اگر ان کی پروا کیے بغیر عمر میں خود سے بیس سال بڑے اور بدمزاج شوہر کو چھوڑ دیں تو بغیر کسی دوسرے کے سہارے زندگی گزار سکیں۔ گھر والوں کے جس عمل کا آپ کو شادی کے بعد علم ہوا اس کی روشنی میں آپ کے احوال پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر　　دشمنوں سے بے وفائی کا گلہ جاتا رہا

جس سے ہم جتنا قریب ہوتے ہیں اس کی طرف سے بے مروتی کا صدمہ اسی قدر گہرا ہوتا ہے۔ سو آپ کے دل پر بھی کبھی نہ مٹنے والا داغ لگ گیا ہے۔ بہرحال زندگی تو ہر صورت میں کاٹنی ہی ہے اس لیے ہم آپ سے یہی چاہیں گے کہ آپ ماضی کو بھول کر اپنے موجودہ حالات کا جائزہ لیں، اس کے امکانات پر غور کریں۔ اس شوہر کے مزاج اور عادات پر نظر کریں۔ اس میں کیا اچھائیاں ہیں، کیا برائیاں ہیں۔ کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ مجموعی اعتبار سے وہ کیسا انسان ہے، اس روشنی میں اگر آپ یہ دیکھیں کہ اس کی رفاقت کو برقرار رکھا اور گرہستی اور خاندان کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے تو اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کیونکہ آپ کو اس وقت ضرورت ہے ایک ٹھکانے کی جہاں آپ دلجمعی سے رہ سکیں۔ اگر آپ کے یہاں کسی بچے کی ولادت ہوجاتی ہے تو اس کا قوی امکان ہے کہ شوہر کے مزاج پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا اور آپ کے لیے اس کے رویے میں بہتر تبدیلی آئے گی۔ پھر جیسے جیسے وہ بچہ عمر کی منزلیں طے کرتا جائے گا آپ کے ساتھ اس کے برتاؤ میں مزید نرمی آنے کی توقع ہے اور اللہ دلوں کو پھیرنے والا ہے۔ آج کی سخت گیری اور بدخوئی کل خوش گفتاری اور نرمی میں بدل سکتی ہے۔

جہاں تک شوہر کے ساتھ آپ کے تعلق کا سوال ہے تو پوری کوشش اس بات کی کریں کہ اس کے ساتھ آپ ایسا رویہ اختیار کریں جس سے یہ نہ ظاہر ہو کہ گھر والوں کی لالچ کا طعنہ دینے پر آپ کو سخت غصہ آرہا ہے بلکہ اس بات کو یوں پیش کریں کہ گھر والوں کا عمل ان کے ساتھ ہے وہ جانیں، میرا تعلق تو اب آپ سے ہے اس لیے مجھ سے جو کوتاہی ہو اس سے مجھے آگاہ کریں تو میں اسے ضرور درست کرلوں گی۔ شوہر کی عمر زیادہ ہو تو اس کا زیادہ امکان رہتا ہے کہ وہ بیوی کے جذبات کا خیال رکھے گا۔

اور اگر اس کے برعکس آپ اس نتیجے پر پہنچیں کہ نباہ کسی حالت میں نہیں ہوسکتا اور کوئی امید اس کی باقی نہیں رہ جاتی تو آپ اس شوہر سے علیحدگی حاصل کرسکتی ہیں چاہے آپ کے گھر والے خوش رہیں یا ناخوش رہیں۔ پھر بھی لگ یہی رہا ہے کہ آپ کے ذہن پر سب سے زیادہ اثر جس بات کا ہوا ہے وہ یہ کہ آپ کے والدین اور گھر والوں نے ایک بڑی رقم لے کر آپ کو شوہر کے ہاتھوں بیچ دیا ہے اور اس طرح اس نے اپنی کبر سنی کے باوجود ایک کم سن لڑکی سے شادی کرلی اور آپ اس کے لیے آمادہ نہ تھیں

سوال میں کئی برسوں سے سحر کی شکار ہوں۔ یہی کوئی دس سال سے اور سحر کرنے والے ہیں میرے چچا چچی، کیونکہ میں نے اکثر ان کی خلاف ورزی کی اور جو کچھ مجھ سے وہ چاہتی تھیں انھیں نہ مل سکا۔ ان کا سلوک میرے والدین کے ساتھ بھی اچھا نہیں، وہ اکثر انھیں جلی کٹی سناتی رہتی ہیں۔ ایک بار میں نے ان کی حکم عدولی کی تو ان کا پارہ چڑھ گیا اور یہ دھمکی دی کہ میں تمہارا جینا عذاب کردوں گا۔ کچھ دن بعد یہ ہوا کہ انھوں نے کہیں سے میری تصویر حاصل کرلی اور میں نہیں کہہ سکتی کہ اس کا انھوں نے کیا بنایا لیکن لمبے عرصے تک میں کام کاج اور شادی سے معذور ہوگئی۔ جب میں کوئی کام کرتی اس میں دل نہ لگ پاتا اور اسی بناء پر مجھ سے شادی کا پیغام بھی کسی نے نہیں دیا۔ میری زندگی واقعی اجیرن ہوگئی۔ میرا کوئی پرسان حال نہیں اور نہ والدین کے پاس اتنی سم ہے کہ میری سحر زدگی کا علاج کرواسکیں۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا کیا کروں اور کہاں جاؤں؟

ارم فاطمہ (پٹنہ)

جواب جو رائے آپ نے اپنی چچی کی طرف سے سحر کیے جانے کے بارے میں قائم کی ہے، ضروری نہیں کہ وہ درست ہو۔ آپ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آپ کی چچی آپ سے کیا چاہتی تھیں جس پر آپ کے انکار نے اس شدید رد عمل پر اکسایا اور انھوں نے سحر کرواکے اپنے انتقام کی پیاس بجھائی۔ ان کا یہ دھمکی دینا کہ میں تمہاری دل کی کایا پلٹ کردوں یہ ثابت نہیں کرتا کہ آپ پر سحر ہوگیا۔ بالفرض اگر ایسا ہوا بھی تو آپ کا دل چچی کی طرف مائل ہوتا یعنی ان کی کہی ہوئی باتوں پر آپ عمل کرتیں۔ بالفاظ دیگر آپ کو مسخر کرلیا جاتا۔ بہرحال اس کی نوعیت جو بھی ہو سحر کا علاج ممکن ہے۔ جس سے بہت سے مریضوں کو شفا حاصل ہوئی ہے اور زیادہ پر اثر ہے یہ ہے کہ وقت پر تمام نمازوں کو ادائیگی کی پابندی کرتے ہوئے رات کو سونے سے پہلے سورہ بقرہ پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر پھونکا جائے اور ہاتھوں کو پورے جسم پر پھیرا جائے۔ سر کی طرف سے ہاتھ پھیرنا شروع کرے اور رفتہ رفتہ پیر تک لائے۔ اس کے ساتھ ہی ایک گلاس پانی لے کر اس پر دم کرلیا جائے۔ رسول اللہ نے فرمایا " اقرآو البقره فان اخذها برکه و ترکها حسره ولا تستطیعها البطله۔

اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ لوگوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کریں، حسب استطاعت ان کے کام آئیں، اس سے وہ آپ کی دلجوئی کریں گے اور آپ کی دشواریاں آسان ہوں گی۔ اللہ کی یاد اور اس کے احکام سے غافل نہ ہوں۔ اللہ نے خود ہی فرمایا ہے ومن یتق الله یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لا یحتسب۔

ناکامی کا خوف میرے حواس پر چھانے لگا ہے

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم فیصلے لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال میں ایک ایسا نوجوان ہوں جس کا بچپن بڑی سخت کوشی میں گزرا ہے۔ میرے والدین میں علیحدگی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے میری پرورش اور تربیت دادی کو کرنی پڑی۔ میرے ماں باپ نے الگ الگ شادی کرلی اور اپنی راہ لی۔ میں دادی کے پاس اکیلا رہ گیا اور ہر چند کہ انھوں نے محنت مشقت کرکے مجھے پالا، ماں باپ کی کمی اور شفقت کا میں متلاشی رہا جو مجھے نہ مل سکی یہاں تک کہ جب میں شعور کو پہنچا تو ارد گرد کی دنیا میں کوئی دل چسپی میرے لیے رہ نہیں گئی تھی۔ کبھی میرا جی چاہتا کہ اپنا خاتمہ کرلوں، کبھی دل کہتا کہ کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا باوجود اس کے کہ میں نے اپنی تعلیم اسی بے رغبتی کی بنا پر ادھوری چھوڑ دی تھی۔ میری مادی حالت اس وقت سے بہتر ہوگئی جب میں نے تجارت میں ہاتھ ڈالا اور اس سے مجھے بہت منافع ہوا۔ میرے ہمدردوں نے یہ دیکھ کر مجھے مشورہ دیا کہ کیوں نہ میں شادی کرلوں کہ زندگی میں کسی قدر قرار آسکے۔ میں نے ان کے اس مشورے پر عمل کیا اور شادی کرلی۔ اب ہمارے یہاں ایک بیٹی بھی ہے پھر بھی رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ میں نے شادی کرکے غلطی کی ہے اور بچوں کی پیدائش کا سبب بننا ایک احمقانہ عمل ہے۔ حالانکہ میری بیوی نیک سیرت اور خدمت گزار ہے۔ مجھے ان سب بکھیڑوں سے بعض دفعہ شدید الجھن اور اپنے آپ سے ندامت ہونے لگتی ہے۔ پھر سوچتا ہوں کہ بیوی اور بیٹی کا اس میں کیا قصور ہے۔ جب میری خجالت اور الجھن بڑھتی ہے تو میں گھر کی چیزیں پھینکنے لگتا ہوں۔ یہ دونوں معصوم سہم کر ایک طرف کھڑے رہتے ہیں۔ براہ کرم اس کا کوئی صحیح علاج تجویز فرمائیں۔

جواب بچپن میں ماں باپ کی شفقت سے محرومی نے آپ کے معصوم ذہن کو بہت متاثر کیا اور اب جب کہ آپ ان حالات کا تجزیہ کسی قدر کرنے کے قابل ہوچکے ہیں تو آپ کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اگرچہ آپ کی پریشانیاں اور الجھنیں سنگین ہیں لیکن اس دنیا میں ایسے بھی افراد ہیں جو اس سے سنگین تر الجھنوں سے دوچار ہیں لیکن ایمان کے سہارے زندگی سے نباہ کر رہے ہیں۔ آپ تصور کیجئے ان بچوں کا کہ جنھوں نے باپ کی صورت دیکھی نہ ماں کی۔ تنکے کی طرح ٹوٹتے بکھرتے رہے۔ کوئی سہارا بن گیا تو اس پر صبر و شکر ادا کیا اور زندگی کو اللہ کی نعمت عظیم جانا اور اسے امانت کی طرح برتا اور اسی لیے اس نے جن چیزوں کو حرام اور مکروہ قرار دیا ہے نہ ان کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھتا ہے اور نہ ہی ان کا خیال دل میں لاتا ہے۔ خود کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اپنے سے بڑے کی عزت و تکریم ان کی کبر سنی اور تجربے کی بنا پر کرتا ہے اور اپنے سے چھوٹے کا لحاظ اس کی کمزوری اور نادانی کی وجہ سے کرتا ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جن کی ہو بہو تصویر ہمیں رسول میں نظر آتی ہیں اور آپ کے اسوہ مبارکہ پر عمل کرنا ہر صاحب ایمان کے لیے باعث سعادت و فلاح دارین ہے۔

سوال میرے شوہر نے ایک دوسری عورت سے بھی شادی کرلی ہے جو عمر میں مجھ سے چھوٹی ہے۔ میں اس لیے اس عورت سے نفرت کرتی ہوں کہ اس نے میرے شوہر کو بانٹ لیا ہے اور میری زندگی میں کڑواہٹ گھول دی ہے۔ شوہر نے بارہا کہا ہے کہ میں اس سے ملنے چلوں یا اسے اپنے پاس آنے کی اجازت دوں لیکن میں نے صاف انکار کردیا۔ اس عورت سے دو بیٹے بھی ہیں۔ ان کی خواہش رہتی ہے میرے بچوں کو لے کر اس کے بچوں سے ملنے جائیں تو یہ بھی مجھے پسند نہیں اور میں اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس معاملے پر ہم میاں بیوی میں تکرار ہوتی رہتی ہے۔ شوہر کا کہنا ہے کہ میں غلطی پر ہوں، اس پر ظلم کر رہی ہوں اور اس کا گناہ مجھ پر ہوگا۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب کیا آپ کے شوہر نے اس عورت سے شادی کرکے اس بات کو آپ سے یا زمانے سے راز میں رکھا؟ کیا یہ عورت آپ کو برا بھلا کہتی ہے اور ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتی ہے جن کا اظہار آپ اس کے لیے کر رہی ہیں؟ کیا وہ اپنے بچوں کو آپ کے بچوں کے خلاف ورغلاتی رہتی ہے؟ کیا آپ کے شوہر کسی طرح آپ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں؟ دونوں کے درمیان عدل پر قادر نہیں ہیں؟ اگر ان باتوں کا جواب نفی میں ہے تو صاف ظاہر ہے کہ آپ کو اس عورت سے حسد ہے اور حاسد کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ خود اپنے حسد کی آگ میں خود جل جاتا ہے۔ عقل ہوش رکھنے والا کوئی انسان خود کو کیوں جلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم نے کئی مواقع پر لوگوں کو حسد کی لعنت سے بچتے رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ خدا سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ □

رشدی کے بعد اب ایک نیا فتنہ

ڈیوڈ کیٹ کی تازہ کتاب "حجاب فاطمہ" سے پیدا ہونے والے سوالات کا ایک جائزہ

نام کتاب :	Fatima's Scarf		
مصنف :	ڈیوڈ کیٹ	تبصرہ :	سنجے سوری
ترجمہ و تلخیص :	س۔احمد	صفحات :	855

ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ یکے بعد دیگر پچیس ناشر کسی معروف ادیب کی تصنیف کو شائع کرنے سے انکار کردیں۔ Fatima.s Scarf (حجاب فاطمہ) کے مصنف ڈیوڈ کیٹ جنھوں نے اس سے پہلے بھی دس ناول اور دیگر موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ کچھ ایسے ہی تجربے سے گزرے ہیں اور آخر کار انھیں اپنا ناول خود ہی چھاپنا پڑا اور ان کے ساتھ ایسا ہونا کوئی حیرت کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ خود انہوں نے اعتراف کیا ہے۔ ان کے ناول کا محور سلمان رشدی کے مماثل جمال رحمان نامی کردار ہے اور کتاب میں مذکور انگلینڈ بردس فورڈ میں آباد مسلمانوں کی زندگی ہے جن کا احاطہ جمال رحمن کو مختلف پہلوؤں سے اپنے ناول The Devil : An Interviw میں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ " حجاب فاطمہ " ایک افسانوی تحریر ہے لیکن اس کی بنیاد ایک حقیقی واقعے میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس کا اعتراف کیٹ نے کتاب میں خود کیا ہے۔

ناول میں دکھایا گیا کہ بردس فورڈ شہر شمالی انگلینڈ کے بریڈ فورڈ سے زیادہ مختلف نہیں ہے جہاں رشدی کی شیطانی آیات کے نسخے 1989ء میں بڑے جوش و خروش سے شعلوں کی نذر کیے گئے تھے۔ کیٹ کے ناول کو ہاتھ لگانے سے ناشرین کے انکار کی وجہ یقیناً یہ خوف رہا ہوگا کہ وہاں کی مسلم برادری کو صدمہ پہنچے گا اور ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ اس سے رشدی کو بھی رنج ہوگا۔

558 صفحات پر مشتمل اس ناول کے تین ابواب ہیں۔ پہلے اور تیسرے باب کا تعلق ایک خیالی شہر بردس فورڈ کی زندگی سے ہے۔ ایسا ہی خیالی شہر ساٹھ سال پہلے جے بی پر مسلے نے پیش کیا تھا جہاں اس وقت ایک مسجد بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ درمیانی باب میں جمال رحمن کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس میں تمام واقعات مصر میں رونما ہوتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے سلمان رشدی کے برعکس رحمان ہندوستان سے نہیں بلکہ مصر سے انگلینڈ پہنچتا ہے۔ یہاں اس کی آمد کا سبب بھی مختلف ہے اور وہ ہے اس کی تحریروں پر مصر کی نئی بنیاد پرست حکومت کا عتاب۔

نسرین جس سے پہلا باب موسوم ہے مودودی مسجد کے سکریٹری حسن حسنی کی بیوی ہے۔ حسن نے اپنی پوری زندگی رحمان کے خلاف ایک حد درجہ اشتعال انگیز پمفلٹ کے لیے وقف کردی ہے جب کہ اس کی بیوی نسرین سیاسی طور پر حق بجانب اپنے مالک راجیولال پر فریفتہ ہے۔

بردس فورڈ کے دیگر باسیوں میں سے ایک اسلامک کونسل کے چیئرمین کی نیم پوش اور عیش طلب بیٹی صائقہ ہے جس کے لیے لندن چمکتا ہوا انعامی تمغہ ہے جس کا حصول رقص اور جنس سے ممکن ہے۔ وہ بردس فورڈ کے ناخواندہ لیکن طاقت ور بیرے طارق کے ہاتھوں اپنی آبرو گنوا بیٹھتی ہے۔ یہی طارق آخر میں رحمان کے قتل کی کوشش کرتا ہے۔

کیٹ کی زبان شاید ہی ناشروں کو خوش کرپائے جن کی نگاہ کتاب کی فروخت پر زیادہ اور اس سے برپا فساد پر کم ہوتی ہے۔ ایک جگہ وہ رقمطراز ہیں۔

بیچارہ اسلام جو اپنے لسانی اقلیم میں کتنا خطیبانہ، شاعرانہ اور تحکمانہ ہے، کافروں کی سرزمین پر کتنا خاکسار اور بے زبان ہے۔ اجنبی بوجھ کو مشرق سے مغرب کی طرف ڈھوتے ہوئے جمال۔ عورتوں میں یہ عدم احترام کا جذبہ کہیں زیادہ واضح ہے۔ اس کے بعد علی چیماے بحث کے دوران رحمان کہتا ہے۔ "مجھے یقین آگیا ہے کہ مذہب اپنی خوبصورت ترین شکل میں المناک فریب نظر اور بدترین صورت میں ایک ڈھکوسلا ہے۔

صوم و صلوٰۃ کی پابند فاطمہ اسکول کی طالبہ اور لاابالی صائقہ کی بہن ہے اور اس کا کردار نسبتاً کم اہمیت کا حامل ہے۔ اسکول میں اسکارف پہن کر وہ ضابطوں کی خلاف ورزی کرتی ہے جس کی سزا میں اسے اسکول سے خارج کردیا جاتا لیکن فاطمہ اتنی پارسا بھی نہیں ہے کہ علی پر تھوڑے بہت ڈورے نہ ڈالے جسے پانے کی وہ خواہشمند ہے اور جسے وہ بھائی سمجھتی رہی ہے۔ وہ اپنی بہن کے حاسدانہ جذبات سے ماورا نہیں ہے۔

رحمان جو رشدی سے مماثل ہے اس کا اسلام سے تلخ سابقہ اس وقت پڑا جب نوجوان اسلام پسندوں کے ایک گروہ نے اس پر حملہ کیا۔ حمیدہ اور ہدی دونوں اس کی خواہش مند ہیں جن کے درمیان رقابت ناول کے درمیان حصے کا موضوع ہے۔ رحمان دو ناولوں The Patriots اور The Crossing کا مصنف بھی ہے جو شائع نہ ہوسکے۔

باقی صفحہ ۱۵ پر

Say No to Peace with Israel

Political Implications of the Hudaibiya Treaty

Allah (swt) described the events of Hudaybiyah as a manifest victory. Rather strangely, many would like to use this 'manifest victory' to legitimise the socalled 'peace with Israel & the occupation of Muslim land by kufr.

"Verily We have granted thee a manifest victory." (TMQ Al-Fath:1)

When we study the Seerah of the Prophet (saw) we see many events which give examples of political plans, political actions and political manoeuvres. For the Prophet (saw) these were revelation, but for his Ummah they serve as evidence and guidance as to its role in domestic and international politics. Political actions are undertaken with a certain viewpoint and objective in mind. The Prophet (saw) carried out political actions with a view to implementing Islam internally and by initiating relationships with a view to facilitating *da'wa* externally. One of the most important events with political implications is the frequently misunderstood agreement at Hudaybiyah between the Islamic State of Madinah and Quraish of Makkah.

Allah (swt) described the events of Hudaybiyah in Surah Al-Fath as a manifest victory. Rather strangely, many would like to use this 'manifest victory' to legitimise the so-called 'peace' with Israel & the occupation of Muslim land by kufr. Many would like to use this victory as a general evidence to compromise in their *Deen* in all situations, and thus accuse the Prophet (saw) of accepting compromise.

The situation prior to Hudaybiyah, was one of humiliation for the kuffar of Quraish. The Prophet (saw) had disrupted their trade routes, undermined their authority in the Arabian Peninsula, and defeated them in battle. However, the Quraish had never accepted the Islamic State of Madinah as a political entity, or Muhammad (saw) as a leader of a state. On this basis the events of Hudaybiyah proved to be a victory for the Prophet (saw). The Quraish prevented the Prophet (saw) from entering Makkah to perform Umrah and sent representatives to negotiate an agreement with him. This was the first victory for the Muslims since it meant that the people who had slandered them, tortured them and boycotted them had recognised them as a political entity to be reckoned with and had recognised that Muhammad (saw) was the leader of this entity. On the international political arena, treaties, cease-fires and agreements are usually made between state and state, not state and individual. The agreement with the Prophet (saw) was seen by all of the other tribes as recognition by Quraish of the existence of a state ruled over by Islam. The Treaty of Hudaybiyah also provides us with the ahkam relating to agreements with the kuffar. It was clear that they are made by the leader (Imam) or his representative, that they must be permissible from the *Shar'a*, that they are beneficial for the Muslims and that they are limited in time. These conditions were not just for Hudaybiyah, because the Sahabah and the Muslims after them implemented these *ahkam* and did not deviate from them in the slightest, indicating that they were from the Sunnah of the Prophet (saw). Such an agreement cannot be compared to the current agreements being accorded in Palestine between the agents of the kuffar and the kuffar. Such a comparison, whether by scholars or not, is an insult to Allah (swt) and His Messenger (saw).

The events of Hudaybiyah allowed the Prophet (saw) to delay conflict with Quraish for a fixed period, and allowed him to punish the Jews of Khaybar who were at that time planning secretly to attack and undermine the Islamic state in Medina with other Arab tribes. Politically, this was very significant since it left the Jews isolated from their allies. For the Ummah of Muhammad (saw) this shows that in our relationships with the kuffar at the international level we should use political manoeuvres and plans. The humiliation and capitulation occurring in the Muslim World, and in particular Palestine, through the form of fake peace agreements does not equate to the political vision of the Prophet (saw) and his companions, rather it equates with treachery and incompetence.

The events of Hudaybiyah do not serve as general evidences for compromise. Firstly, they are not general evidences to be applied in every situation, rather they are restricted to the relationship between the Islamic State and other states and constitute part of the foreign policy of the Islamic State. Secondly, even in the domain of foreign policy, they do not allow compromise since nothing in them is in contradiction with Islam. Compromise suggests that instead of fulfilling the Islamic objective, one purposefully fulfils a kufr objective. Such a notion is rejected outright by Islam.

"It is not fitting for a believer, man or woman, when a matter has been decided by Allah and His Messenger, to have any option about their decision." (TMQ Surah Al-Ahzab:36).

The Treaty of Hudaybiyah should not cause the Ummah to compromise or falter, rather is should instil in the Ummah a political mentality which leads them to establish the Islamic state which will take care of the internal and external affairs of the state. This is the same mentality carried by the Prophet (saw) and his Companions which resulted in the domination of almost the whole of the known world by the system of Allah (swt).

It should be clear that the Sunnah of the Prophet (saw) makes it incumbent upon us to be politicians and for the Islamic State to use political plans and manoeuvres in order to carry the Islamic da'wa to the world. Our understanding of the Sunnah of the Prophet (saw) should lead us to rush to the rightly guided Khilafah that Allah (swt) has ordered us to establish and about which His Messenger (saw) has given us glad tidings. Surely the victory is from Allah (swt) and our return is to Him.

"Allah forbids you friendship with those who fight because of your deen, and drive you out of your homelands, or aid others to do so; and as for those who turn to them in friendship, they are truly wrongdoers." (TMQ Al-Mumtahana:9).

leave alone a Politics of Faith, even if Muslims effectively run their politics exclusively on communal lines, the number of Muslim representatives in Parliament and State Assemblies will not be any the less.

fire having burst into flames, those eyes, nay those spirits, see for sure this very *Ummah* as the embodiment of colourful and glorious practical action. Very particularly in the present political context when the *Ummah* itself is in search of a better and a more brilliant way of acting politically, and what is more, when the regular killings and murders are compelling to ready it for the greatest thinkable sacrifice, then it cannot be very difficult to turn the direction of the *Ummah* to the path of a Prophetic Revolution. Very recently you have made quite a successful experiment in helping the *Ummah* achieve its unity.

The second doubt which is generally beig expressed is that in this way the political appeal at its inception will be limited only to Muslims and so to begin with the standard-bearers of the Polities of Faith shall reach Parliament only on the basis of Muslim votes. And this fact itself will entirely eliminate all Muslims, say, in national politics. Those inclined to think in this fashion very vociferously assert that this shall put a complete stop to the considerable number of Muslim members who at present are able to reach Parliament or some of the state Assemblies on the tickets of different political parties. Perhaps people with these apprehensions have convinced themselves that a considerable number of these Muslims in Parliament and Assemblies are elected on the votes of non-Muslims and also non-Muslim party tickets. This assumption does not have even a distant connection with the truth. I have studied election reports very closely and have also made an approximate calculation of both Muslim and non-Muslim votes in different constituencies, as also the local politics and the caste pressures, and have come to this positive conclusion that leave alone a Politics of Faith, even if Muslims effectively run their politics exclusively on communal lines, the number of Muslim representatives in Parliament and State Assemblies will not be any the less. In spite of the fact that Muslim areas have been included in or excluded from constitutencies in quite a ridiculous manner, even then the situation is that in an exclusively communal politics the community can still obtain at least as many seats as have come to its share so far, entirely on the basis of a politics of insult and shame. As far as the Politics of Faith is concerned, its very operation is such that even tyrannized, scorned and therefore demoralized hearts shall find themselves drawn to cast their votes.

Thus this truth has to a certain extent been established that the Politics of Faith can, even in its first maneuvers achieve what forty years of directionless Muslim politics and in-fighting had made difficult even to imagine. In its first maneuvers the Politics of Faith, helped by the collective struggle of the people of Faith will succeed in sending some forty to fifty people to be members of the Indian Parliament to form a new political group of the *Ummah's* people of Faith. What kind of influence this new group will have in Parliament will largely depend on its very unique and very different way of politicking, sincere and totally selfless, and on the political and faith-worthy perceptions of these people of Faith. However what can be asserted with great confidence is that this small but influential group will oppose tyranny and oppression tooth and nail, standing up as a strong leaden wall against all kinds of exploitation. Consequently if no political party is able to achieve an absolute majority in Parliament, then perhaps no significant move would ever be possible in the House without this group's active assent. And even further, if the country gets a coalition government then the collective moral authority of this group of forty to fifty Parliamentarians could carry a very considerable clout also, so that it would not at all surprise if such a different way of politicking causes a revival of a Josephian model of governance.

One great advantage of initiating again a Politics of Faith would be that the 250 million Muslims of India would not be abjectly looking at others for political direction and guidance and shall instead await Divine Instructions. They would thus put away their political abeyance, fear and even terror would cease, as also would the presence of a sense of mission and the belief in its fulfilment inspire it full of an overwhelming noble strength. Such a mingling of political and ideological aims will render each one of their practical political actions, an invitation and a beckoning and so also each beckoning and invitation a practical political action.

(This is an abridged version of Dr. Shaz's Presidential Address delivered in 1991 at the National Convention of Muslim Indians in New Delhi)

Each and every system which seeks to organize and regulate earthly life, be it sacred to any race or country is rejected by Islam as not being fully sound and proper.

and Shahadat. The very foundation of the future success of the followers of Faith depends only upon one imperative, and that is the extent to which they can tune their lives to these inescapable challenges that go hand in hand with an Islamic revolution. If an international order of justice cannot prevail and instead, world-wide tyranny and extortion be allowed to go from strength to strength where then there is the necessity of Followers of Faith even to be alive and boast that they breathe? The Holy Quran itself has very clear and specific commands promulgated repeatedly about what the supporters of a Divine Revolutionary Mission need to do on such occasions: "Now amongst you in the world, that group is the best which has been singled out to correct and guide (and thus lead to the path of righteousness). You (being that group itself) and have faith in Allah" (Qur'an).

Each and every system which seeks to organize and regulate earthly life, be it sacred to any race or country is rejected by Islam as not being fully sound and proper; for in its perspective only the system sanctioned by Divine Command has in it the justification to become known and celebrated. All else is *Munkar*, however grand be the nomenclature with which it is announced, and that would include such high sounding appellations as freedom, democracy, emancipation, and even human rights. And therefore to destroy all the forms and shapes through which *Munkar* clearly manifests itself and in its stead fully establish the order commanded by the Qur'an, it becomes mandatory that every Muslim should literally step out into the battlefield, ready and prepared even to humbly sacrifice his or her life for the cause of Islam.

Gentlemen! I am afraid that your elders who for years have made it a practical political necessity of surviving by dying many a death in just one life time may they not through their time-serving expediency be compelled someday to contradict the practices of the Prophets. Remember that historical experiment to which attention has been drawn in the Quran itself.

When Moses, upon whom be peace, was sent to liberate the Bani Israel from the over bearing tyranny of the Pharoah and when he invited the people of Faith to gather and organize so as to rise and rebel against the Pharoah, what was the reaction of that community's elders! Time servers and compromisers as they were, it was their perception of the situation which got inflicted upon them the insult of a low and vulgar existence, wherein they had to behold the literal extermination of their race, and even when these elders very well knew that after such an organized genocide perpetrated upon their race, survival of the Faithful on this earth for even a few more years would indeed be very difficult!

But even when one was born amongst them who could cut them free from their chains of slavery and he (Moses) invited them to throw away the collar and manacles of servitude that browbeat them, then, did not the elders of the community say that he (Moses) was only augmenting their existing woes? And, he (Moses) was only putting an agonized people to a harsher test. However this coward leadership could not prevail one bit and ultimately a few high minded individuals followed the revolutionary practices of Prophet Moses cutting away the chains which had bound the community for long. Isn't this community also going through some such delicate phase? Aren't you blind to the regular acts of genocide committed against the Ummah? Hasn't the repeated acts of murder, arson and loot plunged the *Ummah* into a state of psychological fear and apprehension? And do not the voices of your elders start advocating similar restraint if at all they hear of any brilliant revolutionary action contemplated on the lines advocated by the practices of Prophets? Now it is the responsibility of the high-minded youth in the *Ummah* to pay no heed to all such cowardly apprehensions and supposedly foresighted advice, and instead follow the splendid acts of revolution advocated by the practices of prophets so that a new history of the Ummah may get under way.

The Way of Redemption

I call the high minded individuals amongst the Muslim *Ummah* in India that they now not regret the time lost in fear and lack of proper awareness and effort and instead break this mirage of fear for they not only have now to protect themselves but also burdened with the responsibility of retrieving the country itself from the morass of Falsehood and Materialism into which it has abominably sunk. The first step in this direction would be to come forward in this country as the standard bearer of the Politics of Faith rather than join some political coalition, or much worse, become the agents, and instruments of some non-Muslim political organization. The current political situation in the country

<u>Each and every system which seeks to organize and regulate earthly life, be it sacred to any race or country is rejected by Islam as not being fully sound and proper.</u>

and Shahadat. The very foundation of the future success of the followers of Faith depends only upon one imperative, and that is the extent to which they can tune their lives to these inescapable challenges that go hand in hand with an Islamic revolution. If an international order of justice cannot prevail and instead, world-wide tyranny and extortion be allowed to go from strength to strength where then there is the necessity of Followers of Faith even to be alive and boast that they breathe? The Holy Quran itself has very clear and specific commands promulgated repeatedly about what the supporters of a Divine Revolutionary Mission need to do on such occasions: "Now amongst you in the world, that group is the best which has been singled out to correct and guide (and thus lead to the path of righteousness). You (being that group itself) and have faith in Allah" (Qur'an).

Each and every system which seeks to organize and regulate earthly life, be it sacred to any race or country is rejected by Islam as not being fully sound and proper; for in its perspective only the system sanctioned by Divine Command has in it the justification to become known and celebrated. All else is *Munkar*, however grand be the nomenclature with which it is announced, and that would include such high sounding appellations as freedom, democracy, emancipation, and even human rights. And therefore to destroy all the forms and shapes through which *Munkar* clearly manifests itself and in its stead fully establish the order commanded by the Qur'an, it becomes mandatory that every Muslim should literally step out into the battlefield, ready and prepared even to humbly sacrifice his or her life for the cause of Islam.

Gentlemen! I am afraid that your elders who for years have made it a practical political necessity of surviving by dying many a death in just one life time may they not through their time-serving expediency be compelled someday to contradict the practices of the Prophets. Remember that historical experiment to which attention has been drawn in the Quran itself.

When Moses, upon whom be peace, was sent to liberate the Bani Israel from the over bearing tyranny of the Pharoah and when he invited the people of Faith to gather and organize so as to rise and rebel against the Pharoah, what was the reaction of that community's elders! Time servers and compromisers as they were, it was their perception of the situation which got inflicted upon them the insult of a low and vulgar existence, wherein they had to behold the literal extermination of their race, and even when these elders very well knew that after such an organized genocide perpetrated upon their race, survival of the Faithful on this earth for even a few more years would indeed be very difficult!

But even when one was born amongst them who could cut them free from their chains of slavery and he (Moses) invited them to throw away the collar and manacles of servitude that browbeat them, then, did not the elders of the community say that he (Moses) was only augmenting their existing woes? And, he (Moses) was only putting an agonized people to a harsher test. However this coward leadership could not prevail one bit and ultimately a few high minded individuals followed the revolutionary practices of Prophet Moses cutting away the chains which had bound the community for long. Isn't this community also going through some such delicate phase? Aren't you blind to the regular acts of genocide committed against the Ummah? Hasn't the repeated acts of murder, arson and loot plunged the *Ummah* into a state of psychological fear and apprehension? And do not the voices of your elders start advocating similar restraint if at all they hear of any brilliant revolutionary action contemplated on the lines advocated by the practices of Prophets? Now it is the responsibility of the high-minded youth in the *Ummah* to pay no heed to all such cowardly apprehensions and supposedly foresighted advice, and instead follow the splendid acts of revolution advocated by the practices of prophets so that a new history of the Ummah may get under way.

The Way of Redemption

I call the high minded individuals amongst the Muslim *Ummah* in India that they now not regret the time lost in fear and lack of proper awareness and effort and instead break this mirage of fear for they not only have now to protect themselves but also burdened with the responsibility of retrieving the country itself from the morass of Falsehood and Materialism into which it has abominably sunk. The first step in this direction would be to come forward in this country as the standard bearer of the Politics of Faith rather than join some political coalition, or much worse, become the agents, and instruments of some non-Muslim political organization. The current political situation in the country

RNI #57337/94

THE MILLI TIMES
INTERNATIONAL
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Vol.V, No. 3 May, 1998

Time to Introduce a New Political Ethics

As early as in 1991, Dr. Rashid Shaz laid down the charter for a New Muslim Political Party. Now many people are talking about it. Excerpts.

Just sit back and think; think for a moment that it hasn't yet been 75 years since the fall of the Caliphate. For twelve long centuries Islam remained a super power and has been off the international political horizon for a bare 66 years. The story is not at all old when only a few years ago in the politics of power, a few unfortunate tragic incidents following one upon the other transpired and because of the collective conspiracy of powers arraigned against the world of Islam, helped break up the very political fabric of the Islamic world. Can we now not with rejuvenated effort collect our scattered strength to make a new beginning and start afresh, form and reorgnize ourselves into the Oneness that was once the proverbial Islamic unity and launch a Herculean struggle with the aim of reconstituting anew an international order, which we would have established and which we would therefore direct, destroying the very systems and centers of power currently in acceptance and instituting upon their ruins an imposing Islamic political structure? Is it possible that in the present world scenario some such startling change is made and a new situation created in which Islam emerges as the new leader of the civilized world, gain political victory and prevail so that the fate of all the world is put at its disposal? And is it possible that the hapless, helpless *Ummah*, in its wretched period o decline, whose ambitions have been laid low by a succession of abject failures and whose very existence is full of hurts, scars and even wounds, such an *Ummah* yes, such an *Ummah* rise and stand up to challenge head-on the organized forces of Batil so that this Untruth itself may shudder, and fear-stricken step back and, the *Ummah*'s wounded hands twist its ankles and clutch its neck so that no trace of life may remain in its confuted corpse? In my opinion the answer to this question to a large extent depends upon a proper understanding of the modern world and on the strength of a perception which can enthuse eve a vanquished *Ummah* to rise and stand up and determinedly face the Himalyan powers of Darkness and Falsehood. After a great deal of reflection I have come to the conclusion that all this is very much possible and indeed achievable also. Even today the world of Islam can rise and can as yet become a super power. Even today the *Ummah* of Islam can play its pivotal role wherewith Islam can still dominate the world, and in the twinkling of an eye change very basically the very nature of its affairs.
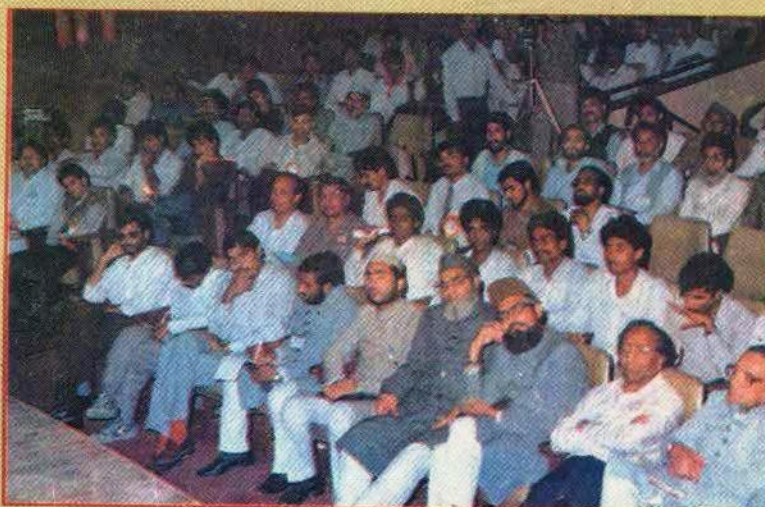
Now this noble end can be achieved only through fresh thinking, holy war and martyrodom, i.e., *Ijtihad, Jihad*